اردو میں ادبا و شعرا کی خودنوشت سوانح
۱۹۸۰ء کے بعد

(مقالہ برائے ایم فل)

مقالہ نگار

محمد نوشاد عالم

نگراں

ڈاکٹر مظہر حسین

(مظہر مہدی)

سینٹر آف انڈین لینگویجز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

۲۰۰۵ء

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
CNTRE OF INDIAN LONGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE
AND CULTURE STUDIES
NEW DELHI-110067

Dated: 13/07/2005

DECLARATION

I declare that the work done in this dissertation entitled **"URDU MEIN ODBA-O-SHORA KE KHUDNAWISHT SAWANEH 1980 KE BAD" (AUTOBIOGRAPHIES OF URDU WRITERS AND POETS AFTER 1980)** by me is an original work and has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/Institution.

MOHAMAD NAUSHAD ALAM
(Research Scholar)

DR. MAZHAR MEHDI
(Mazhar Hussain)
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

PROF. MOHD. SHAHID HUSAIN
(CHAIRPERSON)
CIL/SLL&CS/JNU

فہرست

پیش لفظ

باب اول

اردو خودنوشت سوانح حیات: فن اور روایت ۱۔۳۸

باب دوم

اردو شعرا کی خودنوشت سوانح ۱۹۸۰ء کے بعد ۳۹۔۱۰۴

باب سوم

اردو ادبا کی خودنوشت سوانح ۱۹۸۰ء کے بعد ۱۰۵۔۱۴۹

حاصلِ مطالعہ ۱۵۰۔۱۵۳

کتابیات ۱۵۴۔۱۵۷

پیش لفظ

انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ماضی سے متعلق واقعات وحالات، احساسات و مشاہدات اور داخلی کیفیات کو گاہے بہ گاہے یاد کرتا رہتا ہے۔اس کا حافظہ بہت سے یادگار واقعات وحالات کو اپنے سینے میں چھپائے رکھتا ہے۔لیکن ان واقعات میں سے کچھ ایسے واقعات ہوتے ہیں جو اس کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں جنہیں وہ زندگی میں کبھی بھی فراموش نہیں کر پاتا اور اسے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور احباب کے درمیان بیان کرتا رہتا ہے، اور ان میں سے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جنھیں وہ تحریر کی شکل میں پیش کرتا ہے۔زندگی کے نشیب وفراز، تلخ وشیریں حالات وواقعات اور خوشی وغم کے لمحات سے اس کی زندگی عبارت ہوتی ہے اور وہ ان احساسات ،مشاہدات اور تاثرات کو تحریری شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جسے ہم خودنوشت سوانح حیات کا نام دیتے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات لکھنے کا رواج صدیوں سے رہا ہے ۔ تاریخ شاہد ہے کہ متعدد اکابرین، محققین، دانشوران، سیاست داں، مفکرین اور مؤرخین نے اپنی زندگی کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے، جنھیں پڑھ کر ہمیں نہ صرف ان کی زندگی کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اس دور کی تاریخ، تہذیب وتمدن، سماج ومعاشرہ، عادات واطوار، کردار اور روش ورفتار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ خودنوشت سوانح نگار اپنی زندگی سے متعلق تمام حالات وواقعات کو صداقت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس میں مبالغہ کی گنجائش بہت کم رہتی ہے، جس کی وجہ سے آپ بیتی کی اہمیت دوسری تحریروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ بہت سے سلاطین ، بادشاہ، امرا اور رؤسا نے بھی اپنی خودنوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں جو نہ صرف تاریخی واقعات وحالات اور زندگی کے تجربات ومشاہدات پر مشتمل ہیں، بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم

ہے۔

ہندوستان میں خودنوشت سوانح لکھنے کا رواج مسلم حکمرانوں کے دور سے رہا ہے۔اس وقت فارسی زبان میں خودنوشت سوانح لکھی جاتی تھی۔امیر تیمور کے ملفوظات بھی اسی صنف کے زمرے میں آتے ہیں،اس کے علاوہ ''تزک بابری'' اور ''تزک جہانگیری'' سے ہندوستان میں خودنوشت سوانح کا وجود تحریری شکل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔فارسی خودنوشت سوانح میں شیخ علی حزیں نے جن کا شمار سبک ہندی کے شاعروں میں ہوتا ہے،اپنی زندگی کے واقعات وحالات کے ساتھ ساتھ تاریخی،سماجی ومعاشرتی حالات وواقعات کو اپنی خودنوشت سوانح کا حصہ بنایا ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بے شمار ادبا وشعرا اور سلاطین وامرا نے اس روش کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔اردو زبان میں فارسی کی اتباع میں بہت سے لوگوں نے خودنوشت سوانح لکھنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔لیکن میں نے اپنے مقالے میں صرف ان خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ لیا ہے، جو ۱۹۸۰ء کے بعد اردو کے ادبا وشعرا نے لکھی ہیں۔

مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے باب میں خودنوشت سوانح حیات کی تعریف،اس کے مواد،ہیئت،اسلوب،تاریخی اہمیت،افادیت اور حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور خودنوشت سوانح عمری اور عام سوانح عمری کے درمیان اختلاف اور یکسانیت پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔اردو کی ان اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں خودنوشت سوانح عمری کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔مثلاً روزنامچہ نگاری،سفرنامہ،سرگزشت،مکتوب نگاری اور رپورتاژ اور متفرق مضامین جن میں زندگی کے کسی مخصوص دور یا کسی کارنامے کی روداد بیان کی جاتی ہے۔یہ تحریریں آپ بیتی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر آپ بیتی کی بہت سی خصوصیات رکھتی ہیں۔اس باب میں ۱۹۸۰ء سے پہلے کی بیشتر اہم خودنوشت سوانح عمریوں کا مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے جو مختلف ادوار میں فارسی اور اردو میں ہندوستان و پاکستان میں لکھی گئی ہیں۔

دوسرے اور تیسرے باب میں ۱۹۸۰ء کے بعد کے اردو کے ان اہم ادبا وشعرا کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اردو خودنوشت سوانح حیات کی تاریخ میں کسی نہ کسی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔چونکہ یہ خودنوشت سوانح عمریاں ادیبوں اور شاعروں نے لکھی ہیں اس لیے ان میں ادبی اور علمی معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں۔اس کے علاوہ ادبی تحریکات،اشخاص اور بعض ادبی مباحث کا تاریخی وتنقیدی تجزیہ بھی کیا گیا ہے،اور فن خودنوشت کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں تمام اہم خودنوشت سوانح نگاروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان

خودنوشت سوانح عمریوں پر اظہار خیال کرنے کا مقصد ان خصوصیات کو واضح کرنا ہے جو ان کے موضوع اور اسلوب میں موجود ہیں۔ اور اردو خودنوشت سوانح عمریوں کے سرمائے میں ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد لکھی گئی اردو ادیبوں اور شاعروں کی ان خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ لیتے ہوئے معروضیت اور غیر جانبداری سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالے میں ابتدا سے آخر تک یکساں معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے تمام ضروری پہلوؤں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے لیے مواد کی فراہمی اور اس کی تیاری کے مختلف مراحل میں جن احباب اور کرم فرماؤں کا پرخلوص تعاون مجھے حاصل رہا ان سب کا دل سے ممنون ہوں، خاص طور پر اپنے مخلص رہنما ڈاکٹر مظہر مہدی کی بے لوث عنایات کا معترف و متشکر ہوں۔ مقالے کی ابتدائی منصوبہ بندی سے لے کر آخر تک استاد محترم کی جو مشفقانہ رہنمائی اور حوصلہ افزائی مجھے حاصل رہی اسی کے باعث مقالے کو مکمل شکل دینے میں کامیاب ہو سکا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ استاد کا حق شکریے کے رسمی الفاظ سے ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے والدین اور بھائی بہنوں کی محبت و شفقت اور حوصلہ کے لیے سراپا سپاس ہوں جن کی پرخلوص دعاؤں کے طفیل میں اس مقام تک پہنچا ہوں۔

محمد نوشاد عالم
۲۴۷، سابرمتی ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔ ۶۷

باب اول

اردو خودنوشت سوانح حیات: فن اور روایت

انکشاف ذات کا رجحان انسان میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربات میں دوسروں کو شامل کرنے کا رواج بہت قدیم ہے اور عام خیال یہی ہے کہ خودنوشت سوانح حیات، سوانح عمری سے پہلے وجود میں آئی، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی خود بینی اسے اپنے سے پہلے دوسروں کی خوبیوں اور اچھائیوں کو پسند کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ خودنوشت سوانح عمری کا سراغ یورپی تہذیب اور عیسائیت سے بہت پہلے ملتا ہے۔ اس کی ابتدائی نمونے مصر اور شام کے کتبے میں بھی ملتے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات محض گذری ہوئی باتوں کا اعادہ ہی نہیں بلکہ فن کا جزو لازم ہے۔ ایک عمدہ خودنوشت اپنے اندر صرف تاریخی پہلوؤں کو ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ادبی کارناموں کا ایک جہان چھپائے رکھتا ہے۔ دوسرے (کہانی، افسانے اور ناول وغیرہ) صنف کے برعکس خودنوشت سوانح عمری میں حقیقت، خوبصورت اور مزین الفاظ میں ملبوس نظر آتی ہے۔ فن اظہار ذات کا دوسرا نام ہے اور اس صنف کا تعلق ہمارے داخلی جذبات اور اندرونی کیفیات سے ہے، اس میں بے باک سچائی اور خلوص کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح حیات کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ

اس میں جو کچھ کہا جائے، صفائی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

خودنوشت سوانح حیات سے مراد کسی شخص کے اپنی زندگی سے متعلق خود لکھے ہوئے حالات ہوتے ہیں۔اس میں مصنف اپنی تصویر خود بناتا ہے۔آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔"The story of one's life,written by himself"(کسی شخص کی زندگی کی کہانی خود اس کی لکھی ہوئی ہو)۔[1]

خودنوشت سوانح حیات ایک سخت دشوار اور قوت فیصلہ کو متزلزل کر دینے والی صنف ہے۔اس میں ایمانداری، سچائی، تجزیاتی نظر اور خود آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔اس میں مصنف کے لیے پردہ داری ناممکن ہے، کیونکہ اس کا طرز بیان ہی اسے ظاہر کر دیتا ہے۔مکمل اور جامع خودنوشت کے لیے تخلیق کار میں ایک خداداد صلاحیت، تجزیاتی قابلیت، انتہائی بصیرت اور سب سے زیادہ ایک غیر جانب اور واقعیت پسندانہ طرز عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔خودنوشت سوانح حیات اپنی نوعیت کے لحاظ سے مصنف کی تابع ہوتی ہے۔اس کا اسلوب بیان شخصیت کا ایک جزو ہوتا ہے۔سید عبداللہ نے آپ بیتی کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے روسو کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''ایک اچھی آپ بیتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ نہ چھپائے اور بیرونی معاملات اور تحسین سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ دے، جو اس کے کردار اور اس کی شخصیت کی ہو بہو نقل بن جائے۔۔۔۔ظاہر ہے اپنے کردار اور شخصیت کی ہو بہو نقل کے معاملے میں آپ بیتی لکھنے والے کو جتنی آسانیاں میسر ہیں اتنی مشکلات بھی ہیں۔اظہار شخصیت کی ہر سعی اخفائے شخصیت کے دست بدست چلتی ہے۔اور بہت کم لوگ ایسے نکلتے ہیں جنہیں روسو کی سی اخلاقی یا فکری جرأت حاصل ہوتی ہے۔۔۔۔اکثر آپ بیتیاں یا تو محض منہ پھٹ، پردہ داری کا درجہ رکھتی ہیں یا چیدہ چیدہ واقعات کے گرد گھومتی ہیں یا زندگی کا بیرونی خاکہ بن جاتی ہیں یا اشتہار بن کر تجارت کا ذریعہ بنتی ہیں۔''[2]

خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی ذاتی اور حقیقی زندگی کی کمیوں اور غلطیوں کا اعتراف بڑے اچھوتے انداز میں کرتا ہے۔اس صنف کا مواد خود اپنی ذات سے پیدا کرتا ہے۔اس میں

تخلیق کار خود کوزہ و کوزہ گر، خود ہی مجرم و گواہ اور خود ہی جج ہوتا ہے، اس میں تخیل اور تصور میں اپنی دنیا آباد کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس میں سچائی، ایمانداری اور صداقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو خودنوشت سوانح حیات، سوانح عمری سے بھی زیادہ دلچسپ چیز ہے۔ اس صنف میں شخصیت کے ایسے مظاہر ملتے ہیں جن سے مصنف کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں ہوتا، اس میں مصنف کی داخلی اور خارجی زندگی یکجا ہوتی ہے۔

اظہار ذات ایک فن ہے اور خودنوشت سوانح حیات ایک مکمل فن کی شکل ہے۔ فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو خودنوشت سوانح حیات ایک تاریخی ہی نہیں بلکہ ادب کا شاہکار بھی ہے۔ دوسرے افسانوی صنف کو حقیقت کے قریب لانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن خودنوشت سوانح عمری میں حقیقت کو خوبصورت الفاظ کے ذریعے بیان کی جاتی ہے، کیونکہ اس میں شخصیت کو عوام کے سامنے ہو بہو پیش کرنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مظہر مہدی خودنوشت سوانح حیات کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''خودنوشت سوانح میں اظہار ذات، تاریخی صداقت، جمالیاتی کیفیت اور ادبیت کی موجودگی لازمی ہے۔ یہ ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنف ادب ہے، اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہوتی ہے۔ جذبات کے اظہار کا انداز ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ اس میں مصنف کبھی حزنیہ، کبھی مزاحیہ، کبھی خطیبانہ اور کبھی سنجیدہ انداز اختیار کرتا ہے۔'' [۳]

خودنوشت سوانح حیات میں تخلیق کار کی حیثیت 'ہیرو' کی ہوتی ہے، یعنی مصنف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اس کا موضوع ہوتے ہیں۔ جس کا اظہار مصنف اپنی آپ بیتی میں کرتا ہے۔ عام طور پر مصنف اپنی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو منظر عام پر لاتا ہے جو اس کے نزدیک شایان و زیبا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زیبائش و آرائش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا ہے، یہاں تک کہ مختلف برائیوں کے چہرے پر بھی حسن و خوبی کا رنگ و روغن اس طرح چڑھا دیتا ہے کہ وہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جاتے ہیں۔

حقیقت نگاری بہت دشوار کام ہے اور خاص کر اس وقت جب انسان اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھے۔ ایک عام قاری آپ بیتی کے تخلیق کار سے یہ توقع کرتا ہے کہ زندگی کے سارے واقعات بغیر کسی کمی و بیشی کے بیان کرے۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اکثر مصنف اپنی ذات کا سکّہ

بٹھانے کے لیے مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔لیکن عظیم تخلیق کار اپنی خوبیوں اور خامیوں کو بلا تکلف بیان کر دیتے ہیں۔ایسی شخصیتیں بہت کم نظر آتی ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہوں۔آپ بیتی اس وقت مکمل، کامیاب اور دلکش ہوتی ہے جب تخلیق کار اپنے ذاتی حالات کو بلا کم وکاست بیان کر دے، ورنہ واقعات اور کارناموں میں مبالغہ آرائی آپ بیتی کو آپ بیتی نہیں بلکہ افسانہ بنا دیتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات میں جذباتی انتشار کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودنوشت سوانح عمری عام قاری کو صاحبِ سوانح کے باطنی اسرار ورموز کے جاننے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، جس سے اس کی شخصیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔گویا خودنوشت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قاری صاحب سوانح کی شخصیت کے خدوخال کا عکس دیکھ سکتا ہے۔بعض خودنوشت کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں معمولی انکشاف ذات، حقیقت وسچائی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو بسا اوقات خودنوشت سوانح عمریوں کو زندہ وجاوید بنا دیتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ تخلیق کار کی ذاتی حالات کے علاوہ وقت، عہد اور حالات کی تصاویر کے مرقعے جن سے ہر بالغ نظر مصنف کی تحریر مزین ہوتی ہے، یہ مرقعے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔مثلاً، مرزا غالبؔ کے مکاتیب کبھی اس غرض سے نہیں لکھے گیے تھے کہ ان میں ذاتی سوانح ہوں گی یا ان سے عہد غالبؔ کے بارے میں نہایت دلچسپ معلومات مہیا ہو جائیں گی، جن کا اور کوئی ذریعہ یا اور کوئی ماخذ نظر نہیں آتا۔لیکن مرزا غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انہیں مکاتیب کے ذریعہ ان کا مکمل سوانح حیات تیار کیا جا سکتا ہے، اور سب نہیں تو کم وبیش زندگی میں رونما ہونے والے خاص حالات وواقعات کی تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔انہیں مکاتیب کے ذریعے ہم اس وقت کے انتظامی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی خاکوں کے ایک ایک خانوں میں رنگ بھر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

آپ بیتی پر غور وفکر کرتے وقت اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تخلیق کار نے کس عمر میں خودنوشت لکھی ہے۔خودنوشت زندگی کے آخری عمر میں لکھنی چاہیے، تاکہ زندگی کے تمام تجربات اور مشاہدات اس میں آ جائیں، عام طور پر جب انسان زندگی کے سارے نشیب وفراز دیکھ چکا ہوتا ہے اور آگے اس کے اندر کوئی خواہشات یا نشیب وفراز دیکھنے کی حسرت نہ ہوتی ہے، تب جا کر وہ خودنوشت لکھتا ہے، ایسی آپ بیتیاں پختہ ذہن کا حاصل ہوتی ہیں۔بلیز نگؔ کا کہنا ہے کہ خودنوشت میں انسان دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔صبیحہ انور ایک جگہ لکھتی ہیں:

''خودنوشت میں شخصیت نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خودنوشت سوانح حیات عموماً بڑھاپے کی تخلیق ہوا کرتی ہے۔ پچاس۔ساٹھ۔ستر اور اس سے زیادہ عمر میں لوگوں نے خودنوشت سوانح حیات لکھنے پر توجہ کی ہے۔ یہ زمانہ زیادہ پختگی کا ہوتا ہے اور اس میں کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں رہ جاتا ہے اس کلیہ کا اطلاق صرف مستقل اور باقاعدہ تصنیف پر ہوتا ہے۔''[۴]

ڈاکٹر طفیل احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مختصر لفظوں میں آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات ومشاہدات، محسوسات ونظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے، جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم وکاست قلم بند کردی ہو جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب وفراز معلوم ہوں، اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کو روشنی میں پرکھ سکیں۔''[۵]

خودنوشت سوانح حیات کی تخلیق ہر شخص کے بساط میں نہیں اور نہ ہی اس شخص کے بساط میں جس کے اندر عقل وادراک اور علم کا فقدان ہو۔ خودنوشت کا مصنف ہمیشہ صاحب کمال، ذی علم اور نمایا شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ ہنر وکمال ایک ادیب ہی میں موجود ہو، بلکہ کوئی بھی شخص خواہ وہ سیاست، فوج، مصوری، نقاش، کھیل کود، غرضیکہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، اگر وہ ذی علم اور صاحب بصیرت ہے اور اس کے اندر یہ ہنر وکمال موجود ہے تو وہ اپنی خودنوشت لکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہو تو وہ اپنی زندگی کے نشیب وفراز، تجربات ومشاہدات کو نثر میں بیان کر کے اہل دنیا کو روشناس کرا سکتا ہے۔ خودنوشت نظم اور نثر دونوں میں لکھی جاسکتی ہے، مگر عام طور پر خودنوشت نثر میں ہی لکھی جاتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا میں خونوشت سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"Autobiography is a very close relative, or special form, of biographical literature: it is the life of

a man that happens to have been witten by himself and is therefore unfinished."

''خودنوشت سوانح حیات کا سوانح حیات سے بہت قریبی تعلق ہے یا یہ کہ خودنوشت سوانح حیات، سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ (خودنوشت) ایک شخص کے حالات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کیے ہوں، اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی۔'' [۲]

خودنوشت سوانح حیات ایک ایسا فن ہے جس کا موضوع خود تخلیق کار کی ذات ہے۔ اس میں مرکزی شخصیت تخلیق کار کی ہوتی ہے، جس میں فن کار کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ انسان کی زندگی میں جتنی رنگا رنگی ہوتی ہے اتنا ہی آپ بیتی میں بھی ہوتی ہے، اس لیے خودنوشت کے کوئی بندھے ہوئے اصول نہیں ہیں، لیکن ایک عام قاری خودنوشت سوانح حیات میں کچھ چیزوں کی توقع کرتا ہے۔ اگر تخلیق کار قاری کی شرطوں پر صحیح ثابت ہوتا ہے تو اس کی تخلیق کامیاب اور مکمل مانی جائے گی۔

خودنوشت سوانح حیات میں حقیقت اور سچائی پر پردہ ڈالنا اس کے فن کے لیے عیب ہے، اس سے آپ بیتی کا فن مجروح ہوتا ہے۔ اس لیے حقیقت نگاری اور سچائی خودنوشت سوانح کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے ذریعے خودنوشت کے صفحات پر ہماری زندگی دوبارہ متحرک ہو کر عوام کے سامنے آتی ہے۔ ایک اچھی اور مکمل خودنوشت کے لیے جو چیز سب سے زیادہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے وہ خود فن کار کی انا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شخص نہیں چاہتا کہ وہ اپنی حقیقت اور سچائی کو عوام کے سامنے ظاہر کر کے کم تر ثابت ہو۔ اس لیے اپنی انا اور شخصیت کی پرداخت کا خیال رکھنے والے کبھی بھی اچھی خودنوشت نہیں لکھ سکتے۔

خودنوشت سوانح حیات لکھتے وقت جس صداقت اور سچائی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر نہ وہ خودنوشت کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی وہ آپ بیتی ایک عام قاری کے اندر دلچسپی پیدا کر پاتی ہے۔ اگر تخلیق کار حقیقت اور سچائی سے دامن بچاتا ہے تو سب سے بڑا نقصان اسی کا ہوتا ہے، کیونکہ پردہ داری اور غلط بیانی سے اس کی تخلیق میں سپاٹ پن اور جھول پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے تخلیق کار کو چاہیے کہ حقیقت نگاری سے کام لے۔

جب ہم دنیائے ادب کی آپ بیتیوں پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی تخلیقات مقبول و معروف ہوئی ہیں جن میں حقیقت بیانی اور سچائی سے کام لیا گیا ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز وہ بے باکی ہے جس سے کام لیتے وقت وہ اپنی عظیم اور خوبصورت شخصیت کی image کو مجروح ہو جانے سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے دیوان سنگھ مفتوں کی خودنوشت ''ناقابل فراموش'' کا تعارف کراتے ہوئے برملا گوئی اور حقیقت نگاری پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں برملا گوئی کا دستور عام نہیں اور اردو نثر میں اس کی تحریریں بہت کم ہیں جن میں زندگی کے حالات صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔ جو ہوں بھی تو ضروری نہیں کہ مصنف کی زندگی اس طرح کی ہو کہ ہر شخص کو اس میں دلچسپی ہو۔۔۔ اور پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی زندگی دلچسپ ہوتی ہے وہ ہر قسم کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا اکتا جاتا ہے، یہ نہیں تو زیب داستان کے لئے اس طرح رنگ آمیزی کی جاتی ہے کہ واقعہ قصہ اور قصہ داستان بن جاتا ہے۔'' [1]

ایک مکمل اور جامع خودنوشت تخلیق کرنے کے مصنف کے اندر سچ اور حقیقت کو منظر عام پر لانے کی ہمت ہونی چاہئے۔ اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ میں سچ کہنے اور سچ سننے کی ہمت نہیں ہے، اگر کوئی حقیقت بیانی سے کام لیتا ہے تو اس پر غلط الزام لگا کر اس کی کتاب پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت مصنف کے لیے یہ ہے کہ اس کی کہی ہوئی بات کو قاری یا عوام حقیقت مانیں گے یا نہیں۔ 'سنٹ اگسٹائین' نے اپنی خودنوشت میں ٹھیک ہی لکھا ہے۔ ''وہ (قاری) جب مجھ سے اپنے بارے میں سنتے ہیں تو یہ کیسے مانیں گے یا جانیں گے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں، کیونکہ ایک انسان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے یہ اس کی ضمیر کے علاوہ اور کون جان سکتا ہے۔''

دوسری اصناف سخن میں سچائی کی جو اہمیت ہوتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ اہمیت خودنوشت سوانح حیات میں بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اس فن کے تحریر کا جو تانا بانا بنتا یا جس کے اردگرد بنا جاتا ہے دونوں ایک ہی آدمی کی شخصیت ہوتی ہے، اس لیے مصنف کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات اپنی ذات کا پرتو ہوتا ہے۔ ایک اچھی اور مکمل خودنوشت سوانح حیات میں زندگی میں رونما ہونے والے تجربات، حالات وواقعات اس طرح بیان کئے جاتے ہیں جیسے کہ زندگی میں پیش آئے ہوتے ہیں۔ ایک اچھی اور جامع خودنوشت ہمارے سامنے شخصیت کا بڑا روپ رکھتی ہے، جس میں زندگی، سچائی وحقیقت کے اس لباس میں بے پردہ ہوکر فطری انداز میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، جیسی کہ وہ حقیقت میں ہوتی ہے۔ یہی سادگی اور حسن ہے اور یہ حسن زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہوتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات لکھتے وقت تخلیق کار کی ایک اپنی شخصیت ہوتی ہے جس کے ارد گرد پوری تصویر گھومتی رہتی ہے، جس کا مرکزی کردار خود مصنف ہوتا ہے۔ اپنی ذات سے متعلق وہ خود بیان دیتا ہے۔ آپ بیتی ایک نجی چیز ہوتی ہے اور اس میں لکھنے والے کو اپنی زندگی سے متعلق ،اپنے زمانے کے دوسرے امور، افراد اور حالات وواقعات سے متعلق بہت آزادی کے ساتھ اظہار خیال کا موقع ملتا ہے۔ خودنوشت کے خاکوں میں سچائی، شخصیت کا عکس اور فن کے قدروں کے احساسات سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ ان خوبیوں کے رہتے ہوئے بھی ذاتی بیان کی آپ بیتی میں ہر ایک کو متاثر کرنے والا حسن پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ''ناقابل فراموش'' کے تعارف میں رقم طراز ہیں:

> ''بیشتر واقعات بظاہر اور لوگوں سے متعلق ہیں مگر ان کا راوی سے اتنا تعلق ہے یا اس قدر انہماک ہے کہ ان میں سے اس کا کردار، اپنی شخصیت اپنے آپ پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔'' ۸

خودنوشت سوانح حیات کے مرکزی کردار کے بارے میں ایک جگہ ڈاکٹر مظہر مہدی لکھتے ہیں:

> ''خودنوشت سوانح میں مصنف کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کے وہ مختلف واقعات جو اس کے ظاہری اور باطنی زندگی کے درمیان کش مکش کا باعث ہوتے ہیں اس کا موضوع ہوتے ہیں اور جن کا تخلیقی اظہار کرکے جن میں حقیقت اور تخیل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے، مصنف خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔'' ۹

خودنوشت سوانح حیات محض یادداشت نہیں بلکہ فن کا ایک اہم حصہ ہے۔ایک مکمل اور جامع خودنوشت سوانح حیات کی صرف تاریخی اہمیت ہی نہیں بلکہ ادبی اہمیت بھی ہوتی ہے۔اس کے ذریعے تخلیق کار حقیقت اور سچائی کو خوبصورت الفاظ کے ذریعے عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔فن شخصیت کے اظہار کا دوسرا نام ہے اور آپ بیتی کا تعلق چونکہ ہمارے باطنی جذبات سے ہوتا ہے اس لئے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جاتا ہے۔خودنوشت سوانح حیات کو ادبی دنیا میں ایک فن کی حیثیت حاصل ہے۔اظہار ذات فن ہے اور آپ بیتی خالص فن کی شکل ہے جو ادبی دنیا میں مقبول و معروف ہے۔وہاج الدین علوی نے خودنوشت سوانح کی تعریف کچھ یوں کیا ہے :

> ''خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فرد واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے، جس کے آئینے میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔''[10]

خودنوشت سوانح حیات میں سچائی، شخصیت کے پرتو اور فن کے قدروں کے احساس سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی، حافظے کو کھنگالنے سے زندگی کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں ایک طرح کی طلسمی خاصیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب کو برتنا جانتا ہو۔''[11]

ہر تخلیق مصنف کی ذات اس کے عادات و اطوار اور عقائد کا نچوڑ ہوتی ہے۔اس کے بغیر خودنوشت سوانح حیات بے روح اور کھوکھلی ہوتی ہے۔فن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک آپ بیتی صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ ادبی کارنامہ بھی ہے۔اس میں خوبصورت الفاظ کے ذریعے حقیقت سامنے آتی ہے۔اس کے علاوہ خودنوشت کے فن کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس میں جو کچھ بھی کہا جائے سچائی، دیانت داری اور صفائی کے ساتھ کہا جائے۔

خودنوشت سوانح حیات کی ضرورت اور اہمیت: انسان کے اندر تلاش و جستجو اور تفحص کی خاصیت ابتدا ہی سے پائی جاتی ہے۔کیونکہ انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے۔اس وجہ

سے وہ اپنے اردگرد ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے دیکھتا ہے، اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے۔ ایک طرف انسان اس فضائے بسیط و عریض اور کائنات کے اسرار و رموز کی دریافت کرنے کی لگاتار کوشش کرتا ہے، تو دوسری طرف اپنے اردگرد اور قرب و جوار کی ہر چھوٹی بڑی چیزوں کی طرف تجسس اور ٹوہ کی نظر رکھتا ہے، یہاں تک کہ اپنے ہمسائے کے گھر کے خوراک، عادات واطوار، رسم ورواج اور نشست و برخاست پر اس کی گہری نظر رہتی ہے۔ کبھی اس کا تجسس اس کی عظمت اور بڑائی کا ضامن بن جاتا ہے اور کبھی یہی تجسس اس کی فطری اور جبلی کمزوریوں کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ یہی تجسس و دریافت اور مختلف تجربات دراصل انسانی عظمت اور نسل انسانی کی بقا کا راز ہیں۔ انسان اپنے قبضے میں زمین و آسمان کی بے پناہ وسعتیں اور سمندر کی بیکراں گہرائیاں ہی نہیں بلکہ آسمان کی لامتناہی وسعتوں کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر چکا ہے۔ اور ان دونوں میں اپنی جدوجہد اور تلاش و جستجو سے ارض وسماں کے پوشیدہ رازوں کے باریک سے باریک گوشوں کو انسان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس نے کائنات کی چھوٹی سی دنیا میں آ کر اپنی تلاش و جستجو کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ یہی متلاشی نگاہیں اور تلاش و جستجو کی خواہش کے تحت ہر منزل کو وہ (انسان) چھوڑتا ہوا کاروانِ حیات کی تلاش میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔

دنیا و کائنات کو سمجھنے کے لیے انسان کے پاس دو ماخذ ہیں۔ ایک وہ علم جسے ہم خارجی مشاہدات سے حاصل کر سکتے ہیں اور دوسرا خود اپنی ذات کا مشاہدہ ہے۔ انسان اگر کائنات کو گہری نظر یا بہ نظر غائر مطالعہ کرتا ہے، اس کی پوشیدہ رازوں اور عقیدوں کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو اپنی شخصیت حقیر اور معمولی معلوم ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنی ذات کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے تو ایک نہایت وسیع دنیا آباد ملتی ہے۔ جہاں تک کسی بھی دریافت کرنے والے انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ خارجی علم کو مختلف ذریعوں اور قواعد واصول کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنی کوشش اور جدوجہد سے ایک نئی چیز کا اضافہ کرتا ہے۔ لیکن اپنی ذات تک رسائی کے لیے کوئی ذریعہ یا اصول نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معرفت ذات، خارجی علم کی بہ نسبت زیادہ مشکل و دشوار ہے۔

انسان کے دل و دماغ میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ میری ہستی کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیسا ہوں؟ وہ ان تمام سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالآخر اس کے جوابات خود اپنے آپ ہی تلاش کرتا ہے کیونکہ دنیا ہر لمحہ نت نئی چیزوں کو لے کر انسان کے سامنے آتی ہے۔ اور انسان اس لمحے سے جوابات حاصل کرتا ہے۔ دریافت ہونے کے بعد وہ چاہتا ہے کہ اس

دریافت کو دوسروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس لیے اپنے اردگرد کی دنیا کو اور اپنے تجربات ومشاہدات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا انسانی جبلت اور فطرت میں داخل ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی آواز کو دوسروں تک پہونچائے بلکہ اس طرح وہ خود کو بھی تسکین دیتا ہے۔ کیونکہ اپنی وسیع ذات تک پہونچنے کا اس کے پاس یہی ایک راستہ ہوتا ہے۔

خودنوشت سوانح حیات فرد واحد کی زندگی کی بے باکانہ اور بے لاگ کہانی ہوتی ہے۔ اس میں ذاتی واقعات، تجربات، مشاہدات اور تاثرات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، جو زمان ومکان کے سیاسی ومعاشرتی حالات سے مسلسل نظر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی اپنی زندگی کی تاریخ مصنف کے دور کی ایک مختصر تاریخ بھی ہوجاتی ہے۔ جب ہم کسی دور کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صرف تاریخی واقعات ہی نظر آتے ہیں جسے مورخ اپنے مخصوص خیالات کے ذریعے ہم تک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ہم صرف اس عہد یا دور کی ایک رخی تصویر ہی دیکھ پاتے ہیں۔ ہم اس تصویر کے ذریعے اس عہد کی گوناگوں حالات سے واقف تو ہوجاتے ہیں، لیکن صرف اس تصویر کے ذریعے ہم اس عہد کی روح تک نہیں پہونچ سکتے۔ لیکن خودنوشت سوانح حیات اور روزنامچوں میں عوامی زندگی اور اس دور کے مصور اور شاعر کا ذکر ملتا ہے۔ چونکہ مؤرخ ان تمام چیزوں کو قابل اعتنا سمجھ کر گریز کر جاتا ہے، لیکن ایک خودنوشت سوانح حیات کا خالق اپنے زمانے کے ہر پہلو اور ہر گوشے کو اپنی تخلیق میں شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے خودنوشت سوانح حیات کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ آپ بیتیوں میں اپنے زمانے کا ذکر کم ہو، لیکن اکثر خودنوشت سوانح حیات میں ایسا نہیں ملے گا کہ اپنے عہد کے حالات وواقعات اور معاشرتی زندگی سے بالکل بے نیاز ہو، بلکہ اس عہد کے حالات کا ذکر اس تخلیق میں ضرور ملے گا۔ کسی بھی خودنوشت سوانح حیات کے ذریعے ہم اس دور کے خدوخال کا تصور قائم کرسکتے ہیں۔ بسا اوقات تصویر سازی میں ہمیں کافی مدد ملتی ہے۔ مثلاً، ''تزک بابری''۔ عام طور پر لوگ بابر کی فتوحات کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں، لیکن اس دور کی عوامی زندگی وطرز معاشرت اور طرز حیات کے بارے میں بہت کم علم رکھتے ہیں۔ ''تزک بابری'' ایک ایسی خودنوشت سوانح حیات ہے جس میں ذاتی زندگی کے علاوہ تاریخ کے اہم پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ خودنوشت مؤرخ کے لیے کافی سودمند ثابت ہوتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات میں رہن سہن، عادات واطوار اور زندگی کی باریک سے باریک نکات پر جس طرح تبصرہ کیا جاتا ہے اور اس بارے میں جتنی جامع معلومات فراہم ہوتی ہیں اگر ہم یہی چیزیں کسی تاریخ کی کتاب میں تلاش کریں تو ملنا مشکل ہیں۔ ہماری تاریخ کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ وجدال، انقلاب وانتشار کا مرقع ومجموعہ ہے، جس میں درباری رسوم اور مار دھاڑ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ہم تاریخ کی کتابوں کے ساتھ اس عہد کی خودنوشت کو بھی پڑھیں تو ہمیں تمام گوشوں کے بارے میں بالتفصیل جانکاری مل جائے گی۔

سر تیج بہادر سپرو نے ''یاد ایام'' کے مصنف نواب سعید احمد چھتاری کے مقدمے میں خودنوشت سوانح حیات کے تاریخی پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ایسی کتابوں سے خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے ملک کی ترقی وتنزلی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ایسی کتاب سے تاریخ کا مواد تیار ہوتا ہے۔''[۱۲]

اردو خودنوشت سوانح حیات کے اظہار کی مختلف نوعتیں: تخلیق کار یا فن کار اپنی ذات کے اظہار کے لیے مختلف ذرائع تلاش کرتا رہتا ہے، وہ زندگی میں ہونے والے حالات وواقعات اور تاثرات کو عوام کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے، اور اس کے لیے وہ روزنامچے، مکاتیب، سوانح عمری، سفرنامے اور رپورتاژ وغیرہ کا سہارا لیتا ہے۔ ادب کی یہ وہ اصناف ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔

رپورتاژ نگاری:۔ رپورتاژ کا انحصار سچائی اور حقیقت پر ہوتا ہے۔ اصناف کے ذریعے عام قاری افسانے کی تصوراتی اور ماورائی دنیا سے باہر نکل کر حقیقت اور سچائی کی سخت زمین پر قدم رکھتا ہے۔ رپورتاژ اس سچ کو موضوع بناتا ہے جو زندگی کی عام ڈگر پر چلتے ہوئے غیر معمولی انداز میں تخلیق کار کے سامنے آتا ہے۔ مصنف کی عینی شاہد ہونا رپورتاژ کو سب سے زیادہ معتبر بنا دیتا ہے۔ غالباً اسی لیے کیری (CAREY) نے آپ بیتی، سوانح عمری، ڈائری، سفرناموں اور خاکوں کو بھی اس صنف کی حدود میں شامل کیا ہے۔

رپورتاژ فرانسیسی ادب کی دین ہے، اس کا رپورٹ یا خبر سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مصنف کو چاہیے کہ کسی واقعے سے متعلق اپنے تاثرات کو رپورتاژ کی شکل میں لکھ دے، تاکہ جذبات کی سچی اور صحیح عکاسی ہو سکے۔

اردو میں رپورتاژ کا آغاز اس وقت ہوا جب ادب اور زندگی میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔تخلیق کاروں نے بھی ان تبدیلیوں کو محسوس کیا اور اپنے خیالات کی ترویج واشاعت کے لیے رپورتاژ لکھے۔اس میں زندگی کے ہر پہلو، واقعہ یا حادثہ کے متعلق گفتگو کی جاسکتی ہے۔تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، ظلم وبربریت اور مہاجرین کی نوآبادکاری کو لے کر جو رپورتاژ لکھے گئے وہ زیادہ پراثر ہیں، دیگر موضوعات پر بھی رپورتاژ لکھے جاسکتے ہیں۔رپورتاژ کو ہمیشہ حقائق کے تئیں پرخلوص ہونا چاہیے۔مصنف کے لیے لازمی ہے کہ وہ جس چیز، جس حادثے، یا واقعے کو جس طرح دیکھے بالکل اسی طرح بیان کردے۔اس میں تخلیق کار کو غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔اس میں خارجی اور داخلی احساسات کا حسین امتزاج پیش کیا جاتا ہے۔یہ وہ صنف ہے جس میں اہم اور غیر اہم واقعات وحادثات کو ایک ادبی شان سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس میں خارجی انداز بیان کو داخلی انداز بیان میں شامل کرکے فن کارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب نگاری:۔مکتوب نگاری نثر کی ایک اہم صنف ہے۔یہ فنون لطیفہ کی باضابطہ شاخ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ اور بے حد نازک فن ہے۔یہ ایک ذاتی اور شخصی چیز ہے، جس میں بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں۔لہذا دوسرے اصناف سے یہ زیادہ معتبر ہوتا ہے۔دوسرے اصناف مثلاً، خودنوشت، روزنامچے، سفرنامے، سوانح عمری اور رپورتاژ وغیرہ بھی دلچسپ ہوتے ہیں، مگر مکتوب کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور حقیقت آمیز ہوتا ہے۔اس کا موضوع زندگی کی طرح بے حد وسیع ہے۔اس میں ان تمام حالات وواقعات، تجربات ومشاہدات اور تاثرات واحساسات کو شامل کیا جاسکتا ہے، جو ایک عام آدمی کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔اس میں ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی جاسکتی ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی کے زیر اثر ہوا۔واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کو اردو مکتوب نگاری کا اولین نمونہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد مرزا غالبؔ نے اس صنف کو بام عروج پر پہونچایا۔سوانحی نقطۂ نظر سے خطوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔اس کے ذریعے مصنف کے بارے میں بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکتیں۔اس کے علاوہ اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس سے سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، ادبی اور اقتصادی حالات کا پتہ چلتا ہے۔یہ ایک پیغام رسانی کا ذریعہ بھی ہے، جس میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان راز ونیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔خطوط کسی شخص کی نجی زندگی سے پوری طرح واقف

کراتے ہیں۔اس لیے مکتوب نگاری کو سوانحی اصناف میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

روز نامچہ نگاری:۔نثری اصناف میں روز نامچہ نگاری کی اہمیت مسلّم ہے۔یہ صنف اظہار ذات کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔اس کا بنیادی محرک شعوری یا غیر شعوری طور پر روز نامچہ کے تخلیق کار کی ذات ہوتی ہے۔اس کا تعلق انسان کی زندگی سے بہت قریب ہے۔یہ صنف آپ بیتی کے فن سے بہت نزدیک ہے۔کیونکہ دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔آپ بیتی اور روز نامچہ میں قریبی تعلق ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان کافی فرق بھی ہے۔روز نامچہ میں روزانہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو قلم بند کیا جاتا ہے، جبکہ آپ بیتی کا تخلیق کار واقعات کے رونما ہونے کے ایک عرصہ بعد ضبط تحریر میں لاتا ہے۔آپ بیتی کا تخلیق کار آپ بیتی میں انہیں واقعات وحالات کو قلم بند کرتا ہے، جس کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے، جبکہ روز نامچہ میں زندگی میں رونما ہونے والے بہت سارے واقعات ہوتے ہیں، بھلے ہی ان کا تعلق مصنف کی ذات سے ہو یا نہ ہو۔

انگریزی ادب میں روز نامچہ نگاری کی وقیع روایت رہی ہے۔یہ صنف ادب کی قدیم اصناف میں شمار کی جاتی ہے۔اس میں زندگی میں پیش ہونے والے روزمرہ کے ریکارڈ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس میں تاریخی، سوانحی اور ادبی رنگ بھی ملتے ہے۔اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو فوراً اور اگر ممکن ہو تو اسی دن قلم بند کر لیا جائے۔خودنوشت اور روز نامچہ میں مماثلت ہونے کے باوجود دونوں میں بہت فرق ہے۔روز نامچہ کو ایک حد تک غیر مرتب خودنوشت کا خاکہ کہا جاسکتا ہے۔

سفر نامہ نگاری:۔سفر نامے صرف زندگی کے حالات وواقعات اور تجربات ومشاہدات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے ذریعے زندگی کے کچھ نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ایک سیاح یا مسافر جن ممالک سے گذرتا ہے وہاں کی چیزوں کو دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے، اور اس سے متاثر ہو کر سفر ناموں کی شکل میں مرتب کرتا ہے۔اس کے ذریعے ہم سوانحی اور جغرافیائی معلومات کا ذخیرہ فراہم کر سکتے ہیں۔سفر نامے منفی اور مثبت جذبات وخیالات اور اثرات کے مرکب ہوتے ہیں۔اس کے ذریعے انسان اپنے داخلی احساسات کو خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر ذہنی اور دِلی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔

انیسویں صدی اردو سفر نامے کے لیے ایک بہت اہم صدی ہے، اس عہد میں جہاں دوسرے موضوعات مثلاً، سوانح، مضمون، تاریخ، سیرت اور آپ بیتی وغیرہ پر زور دیا گیا وہاں سفر ناموں پر بھی اہمیت دی گئی۔اردو زبان وادب کی ترقی اور اردو نثر کو آسان بنانے میں اس صنف کا

بہت اہم کردار رہا ہے۔اس کے ذریعے اردو میں بہت سے نت نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے۔اس کے معنی داستان سفر، روداد سفر یا سفر کے قصے ہوتے ہیں، جسے تحریری شکل میں پیش کیا گیا ہو۔ یہ اپنے عہد کی سماجی اور تاریخی دستاویز ہوتی ہے۔

سفر نامے اردو زبان و ادب کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔اردو نثر کی ترقی میں اس صنف کا اہم رول رہا ہے، یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں بیک وقت کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں، یہ کسی زمانے کی تاریخ اور اس زمانے کے تہذیبی اور معاشرتی حالات کا عکاس بھی ہے۔اس میں قصہ پن اور کہانی پن بھی موجود ہوتا ہے، جبکہ دیگر اصناف میں اتنی وسعت نہیں ہے۔سفر نامے زندگی کی جذبات و خیالات اور تجربات و مشاہدات کی وہ مربوط داستان ہے جس میں انسان اپنی ذاتی تاثرات و احساسات کو قلم بند کرتا ہے۔

سرگذشت نگاری:۔خودنوشت سوانح حیات اور سرگذشت میں تخلیق کار اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اور تجربات و مشاہدات پیش کرتا ہے۔دونوں کے اندر انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے۔خودنوشت اور سرگذشت میں مماثلت کے باوجود اس میں ہم فرق کر سکتے ہیں۔خودنوشت کا مصنف اپنی زندگی کی تاریخ لکھتا ہے جبکہ سرگذشت میں عوامی حالات و واقعات ہوتے ہیں۔خودنوشت سوانح حیات میں تخلیق کار اپنی تاریخ میں اپنے حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات اور افکار و جذبات کو بیان کرتا ہے، دوسرے اشخاص کے ذکر ناگزیر حالات میں آتے ہیں لیکن سرگذشت میں تخلیق کار کی ذات کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اس میں ان اشخاص، واقعات و حالات کا تذکرہ ہوتا ہے جن کا تعلق کسی طرح تخلیق کار سے رہا ہو۔

عام طور سے ہندوستان میں سرگذشت لکھنے کی روایت بہت قدیم ہے۔لیکن سرگذشت لفظ کا استعمال بہت بعد میں اردو ادب میں ہوا۔'تزک بابری' اور 'تزک جہانگیری' اپنے مواد کے اعتبار سے سرگذشت کے دائرے میں آئیں گے۔ کیونکہ اس میں خارجی حالات کا ذکر بہت زیادہ ہے۔آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں خودنوشت اور سرگذشت ایک دوسرے میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ سرسری نگاہ میں دونوں کو الگ کرنا بہت مشکل ہے۔خودنوشت اور سرگذشت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ خودنوشت کا تخلیق کار داخلیت پر زیادہ زور دیتا ہے، جبکہ اس کے برعکس سرگذشت کا خالق خارجیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔

سوانح نگاری:۔خودنوشت سوانح حیات اور سوانح حیات، دونوں ہی سے ہمیں کسی شخص کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اور تجربات و احساسات سے آگاہی ہوتی

ہے۔دونوں میں مماثلت ہونے کے باوجود دونوں کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔خودنوشت میں ایک شخص اپنے متعلق خود لکھتا ہے، جبکہ سوانح حیات میں صاحب سوانح کی زندگی کے حالات وواقعات دوسرے کے ذریعے مرتب کیا جاتا ہے۔اس میں دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے،اور خطوط ،ڈائری،روزنامچے اور سرکاری ریکارڈ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔جبکہ خودنوشت سوانح حیات کا تخلیق کار اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں جانتا ہے اور اپنی یادداشت کے سہارے اپنی پوری آپ بیتی لکھتا ہے۔اس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ مصنف اپنی حالات زندگی خود لکھتا ہے اس لیے شائع ہونے کے بعد ردو بدل کی گنجائش اس میں نہیں رہتی۔اس کے برخلاف سوانح عمری حرف آخر نہیں ہے کیونکہ صاحب سوانح کے بارے میں تازہ معلومات کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔

سوانح حیات ایک مخصوص فرد کی زندگی کا مطالعہ ہے، جس میں ادبیت کی چاشنی بہت ضروری ہے۔اس میں مرکزی حیثیت صاحب سوانح کی ہوتی ہے۔یہ ایک ایسا فن ہے جس میں فن کار کسی شخص کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہوتا ہے۔یہ ایک ایسا فن ہے جو بہت نازک اور دشوار کن ہے۔کیونکہ تخلیق کار کا سب سے اہم کام صاحب سوانح کا انتخاب کرنا اور اس کے پورے حالات وکوائف کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے تاکہ صاحب سوانح کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال سکے۔تخلیق کار کے اندر ایمانداری، دیانتداری، جفاکشی اور انصاف پسندی ہونی چاہیے، تاکہ سوانح حیات میں صاحب سوانح کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو اجاگر کر سکے۔ایسا نہ ہو کہ دوست کی کمزوریوں اور دشمن کی خوبیوں کو اپنی تخلیق میں چھپا کر پیش کرے۔اس لیے تخلیق کار کو ایمانداری اور غیر جانبداری سے دونوں کی خامیوں اور خوبیوں کو بیان کرنا چاہیے۔

کسی فرد واحد کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کسی دوسرے شخص کے ذریعے تحریر میں لانا سوانح نگاری ہے۔اس میں صاحب سوانح کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، اور اس کے اردگرد ہی سوانحی ادب گھومتا ہے جو اسے تاریخ سے الگ کرتا ہے۔تاریخ میں مختلف اشخاص کے کارناموں اور قوموں کے عروج وزوال کی داستان ہوتی ہے۔جبکہ سوانح صرف ایک فرد یا ذات کی تاریخ ہوتی ہے۔دیانت داری اور انصاف پسندی اس کے لازمی اجزاء ہیں۔

اردو ادب میں سوانح نگاری کو بطور فن برتنے والے مولانا الطاف حسین حالؔی ہیں، اس کے علاوہ شبلی نعمانی نے بھی فن سوانح نگاری کو نئی آب وتاب بخشی۔

اردو خونوشت سوانح حیات کی روایت: انکشاف ذات کا رجحان انسان میں ہمیشہ

سے پایا جاتا ہے۔اپنی ذات کے بارے میں اظہار خیال کرنا اور اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کا رواج بہت قدیم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ خودنوشت سوانح کے ابتدائی نمونے کافی قبل ہی سے وجود میں آچکے تھے۔مسلمانوں کے عہد میں بھی یہ صنف بے رواج نہیں رہی اور کافی ترقی کی۔'ابن خلدون' نے اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھی، اور اس کے بعد یہ سلسلہ قدرے بے ضابطہ چلتا رہا۔

فارسی میں آپ بیتی کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔مغل بادشاہ اگر اپنی توزکیں نہ لکھ جاتے تو شاید اب تک یہ ادب اس صنف سے محروم رہتا۔اگر چہ شہنشاہ بابر کی ''تزک بابری'' اصل میں ترکی زبان میں تھی، مگر اکبر کے حکم سے اس کو فارسی زبان میں منتقل کرایا گیا، بعد میں اس کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ہوئے۔اس کے مطالعے سے ایک بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس کا مصنف فطرت انسانی کا بہت بڑا نباض ہے اور اس کی نظر جزئیات تک جاتی ہے۔ترکی زبان اس کی مادری زبان تھی جس میں وہ شعر کہتا اور روزنامچہ لکھتا تھا۔جسے آج 'بابر نامہ' یا 'تزک بابری' کہا جاتا ہے۔دوسرے بادشاہوں کی خودنوشت سوانح عمریوں میں اسے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔

جہانگیر نے اپنی زندگی کے واقعات کو ''تزک جہانگیری'' میں تحریر کیا ہے۔یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ہم جہانگیر کے مذاق کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔اس نے واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے بجائے انہیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو اس کی طبیعت پر اثر انداز ہوئے۔وہ نہ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالتا ہے اور نہ اپنی خوبیوں کو اجاگر کرتے وقت شرم محسوس کرتا ہے۔وہ شراب پیتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر رات کو پچھلے پہر اٹھ کو اللہ اللہ کرتا ہے تو اس کا حال بھی لکھتا ہے۔

فارسی آپ بیتیوں میں شیخ علی حزیں کی آپ بیتی خاصی اہمیت کے حامل ہے۔انہوں نے اپنے دور کے تاریخی اور سوانحی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد اردو کے نامور شاعر میر تقی میر کی آپ بیتی ''ذکر میر'' جو فارسی زبان میں ہے۔اس آپ بیتی میں ذاتی بیان ہی سب کچھ ہے۔اس آپ بیتی میں میر کی ذات کا انکشاف واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔

فارسی زبان اور اردو زبان میں بہت گہرا رشتہ ہے۔فارسی زبان کو امرا، وزرا اور درباروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔جبکہ اردو زبان کو اس وقت شاہی درباروں کی سرپرستی حاصل ہوئی جب دربار ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔تاہم اردو زبان میں وہ خوبیاں موجود ہیں جن کی بدولت بادشاہوں کی سرپرستی نہ ہونے کے باوجود اپنا مقام خود پیدا کی اور آج اس زبان کی اہمیت دوسرے

زبانوں کے مقابلے میں کم نہیں ہے۔

اردو ادب میں جب ہم خودنوشت سوانح حیات کے سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بے حد قلیل معلوم ہوتا ہے، مگر اطمینان بخش بھی ہے۔ اردو میں پہلے پہل دکنی مثنویوں میں ایسے نقوش ملتے ہیں جس میں بعض شعرا نے اپنی ذاتی زندگی اور اپنے تمام حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے مبہم نقوش صوفیاء کرام اور بزرگان دین کے ملفوظات، تذکروں، تاریخوں، روزنامچوں، تزکوں اور مکتوبات وغیرہ میں ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ میر امن کا دیباچے اور فورٹ ولیم کالج کے دیگر مصنفین کی تخلیقات میں بھی اس کے دھندلے نقوش مل جاتے ہیں۔ لیکن اسے خودنوشت سوانح حیات نہیں بلکہ اس صنف کے ابتدائی نقوش کہے جا سکتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ایک طویل مدت تک اس صنف کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔

اس صنف کو فروغ دینے میں انگریزی زبان وادب کا مطالعہ بہت حد تک معاون و مددگار ثابت ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں خودنوشت سوانح حیات ایک مستحکم صنف ادب رہی ہے۔ انگریزی ادیبوں اور دانشوروں نے خاصی بے باکی، سچائی اور حق پسندی کے ساتھ اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ یورپ کی اثر کی وجہ سے اردو ادب میں بہت سی مقبول و معروف آپ بیتیاں ترجمہ ہو چکی ہیں جو سب انگریزی کے راستے ہم تک پہونچی ہیں۔ آج انگریزی زبان ہمارے نصاب تعلیم میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ بیتیوں کے معاملے میں اردو زبان دیگر مشرقی زبانوں سے زیادہ مالا مال ہے۔ آزادی کے بعد تو اردو ادب میں بے شمار خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئیں اور عالمی ادب میں مقبول و معروف بھی ہوئیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کچھ دنوں بعد ہی بعض لوگوں نے تھوڑے تھوڑے واقعات قلم بند کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس دور کی ابتدائی آپ بیتیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کے کچھ اہم واقعات و حالات اور خدمات قلم بند کئے تھے۔ اس دور کی سب سے پہلی تحریر جو خودنوشت سوانح حیات کی تمام خصوصیات سے مزین ہے، جس میں مصنف کی زندگی کے پورے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، وہ مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت سوانح حیات ''تواریخ عجیب'' (کالا پانی) ہے۔ بقول علیم الدین سالک ''سب سے پہلی آپ بیتی جو اردو زبان میں لکھی گئی جعفر کا کالا پانی ہے''[۱۳]

جعفر تھانیسری بہت بڑے مجاہد تھے۔ اور بحیثیت ایک مجاہد آزادی کالا پانی کی سزا کاٹی۔ لیکن اس قید و بند کو انہوں نے معمولی واقعہ کہا ہے۔ انہوں نے وطن اور آزادی کی محبت میں بڑی سے بڑی

مصیبت کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا ہے۔اس آپ بیتی میں انڈمان کے باشندوں کی مختصر تاریخ، وہاں کے رسم ورواج، رہن سہن، مذہبی عقائد، آب وہوا اور تہوار وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔انہوں نے انگریزوں کے ظلم وستم اور اس دور کے روزمرہ حالات کو قلم بند کیا ہے۔ بقول وہاج الدین علوی ''تواریخ عجیب جعفر تھانیسری کی زندگی کا وہ مکمل باب ہے جس میں ان کے مذہبی اور سیاسی زندگی کے حالات درج ہیں۔'' [۱۴]

دوسری اور قابل ذکر آپ بیتی جس کا تعلق اس ہنگامے سے ہے، ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر'' ہے۔اس آپ بیتی میں اپنی زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ اس وقت کے سیاسی وسماجی حالات اور ہنگامے کی داستان کو بڑی تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔اس کے مطالعے سے لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرت کے چند دھندلے نشانات ملتے ہیں۔اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ منظر نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی ''داستان غدر'' ایک اچھی خودنوشت ہے۔ظہیر دہلوی نے ہر چیز کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔اور ہر قدم پر احتیاط کا سہارا لیا ہے۔اس میں دہلوی تہذیب وتمدن کا رنگ وآہنگ شامل ہے۔اس کی ادبی وتاریخی اہمیت آج بھی برقرار ہے اور اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں اس کا مقام سرفہرست ہے۔

ایام غدر منشی محمد عنایت حسین کی خودنوشت ہے۔اس میں غدر کے حالات، لال قلعے کی زوال پذیر تہذیب اور معاشرے کا ذکر ملتا ہے۔اس آپ بیتی میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔تقریباً اسی عہد میں ایک اور مشہور ومعروف شخصیت عبدالغفور نساخ کی خودنوشت ''سوانح عمری'' ۱۸۸۸ء ہے۔یہ خودنوشت سوانح عمری اپنے مواد کے لحاظ سے اردو کی ابتدائی خودنوشتوں میں بہت ممتاز ہے۔اس میں اس عہد کے معاشرت، ادبی معرکے، لکھنؤ اور دہلی کے مجلسوں کا حال، بنگال کے عوام کی تصویر اور لوگوں کے عام رجحانات کا ذکر ملتا ہے۔چند خامیوں کے باوجود اردو خودنوشت سوانح حیات کی فہرست میں نساخ کی خودنوشت اپنی معلوماتی خصوصیات کے سبب ایک منفرد خودنوشت ہے اور اس کی اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے۔

۱۹۹۹ء میں دو خودنوشت شائع ہوئیں، جو دونوں نامکمل ہیں۔پہلی خودنوشت ''آپ بیتی'' خواجہ حسن نظامی کی ہے۔خواجہ حسن نظامی ایک انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور تھے۔۱۹۱۹ء میں ''آپ بیتی'' کے نام سے اپنے حالات زندگی شائع کئے۔خواجہ حسن نظامی اصلاً پیر تھے اور خانقاہی نظام سے ان کا تعلق تھا۔اس لئے اس آپ بیتی میں جابجا مریدوں سے خطاب کرتے نظر آتے ہیں جس کے

باعث اس میں ناصحانہ اور مبلغانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جو خودنوشت سوانح کی عام دلچسپی میں خلل ڈالتا ہے۔

دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے تمام حالات بیان نہیں کیے ہیں۔ واقعات و حالات کی قطع و برید کے باوجود خواجہ صاحب کے بہت سے پہلو اس میں نظر آتے ہیں، جن میں ایک تسلسل ہے۔ اس آپ بیتی میں ان کی پیدائش، بچپن، تعلیم و تربیت، آغاز جوانی، شادی و پیشہ کے سلسلے میں جدوجہد سے متعلق بہت سی جانکاری ملتی ہے۔ اپنے خاندان کے حالات اور ماحول کا ذکر ایسے کرتے ہیں کہ ساری خوبیاں اور خامیاں واضح ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت سوانح عمری کی سب سے بڑا نقص اس کا ناصحانہ انداز ہے۔ جبکہ آپ بیتی سے عام قاری یہ توقع کرتا ہے کہ اس میں اعمال و افعال، نتائج کے بغیر سچائی و بے باکی سے بیان کیا گیا ہو۔ اس آپ بیتی سے بہت سارے واقعات خارج بھی کر دیے گئے ہیں جس سے اس آپ بیتی کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ خواجہ صاحب نے چند واقعات کے سہارے اپنی حیات کا خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔

تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر ہے، جس کے مرتب فضل الدین احمد ہیں۔ اس کتاب کو مولانا آزاد اپنی یادداشت کے سہارے ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ اور پانچ ماہ کی قلیل مدت میں اسے مکمل کیا جس کی وجہ سے اس میں سوانحی تسلسل مفقود ہے۔ اس خودنوشت کا زیادہ تر حصہ سیاسی، سماجی، خاندانی، مذہبی اور معاشرتی حالات و مسائل پر مبنی ہے۔ آخری چند صفحات آپ بیتی کے انداز پر لکھے گئے ہیں، لیکن ان سے آپ بیتی کا مقصد پورا نہیں ہوتا، جا بجا شرعی مسائل، مذہبی و سیاسی حالات کی تفصیلات سے مولانا کے زور بیان، قدرت اور عملی جوش کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کتاب سے ان کے عادات و اطوار یا سیرت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

نیرنگئی بخت (میری اپنی کہانی) وزیر سلطان جہاں ۱۹۴۲ء کی اردو میں کسی خاتون کے قلم سے لکھی گئی پہلی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ آپ بیتی ایک خاندان اور چند گھروں کی کہانی ہے۔ اس میں افسانوی انداز پایا جاتا ہے۔ جو ناول نگاری کے ابتدائی دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں سچائی کا عنصر غالب ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں جہاں اظہار ذات معیوب سمجھا جاتا ہے وہاں کسی خاتون کا یہ قدم

نہایت جرأت مندانہ ہے۔ مصنفہ ایک ایسی خاتون تھیں جو نہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ تھیں اور نہ ہی باقاعدہ انہوں نے اپنے گھر پر تعلیم حاصل کی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس خودنوشت کی ترتیب، شگفتہ انداز بیان اور جزئیات تفصیل اتنی دلکش ہے کہ اہل قلم کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ یہ آپ بیتی محدود ہونے کے باوجود بھی سادہ اور دلکش ہے۔ اس کے مطالعے سے دولت مند گھرانوں کے رہن سہن، تہذیب وتمدن کے واضح نقوش ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں عورتوں کے انداز فکر اور اس کے جذبات کو سمجھنے کے لئے خاصہ اہم مواد مل جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ خودنوشت کسی سماجی، سیاسی اور ادبی اہمیت کے حامل نہیں ہے۔

اعمال نامہ سر رضا علی ۱۹۴۳ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ رضا علی کے حالات زندگی کا ''اعمال نامہ'' ہے۔ اس آپ بیتی کو اردو خودنوشت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں مغربی معیار سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مغربی طرز سر رضا علی کو اس قدر پسند ہے کہ اس طرز پر اپنی آپ بیتی کے ساتھ اپنے زمانے کے سیاست، معاشرت، ملکی حالات، تعلیم، مذہب، اردو ہندی جھگڑا، تہذیب وتمدن اور علی گڑھ کی سرگرمیوں کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے کہ یہ کتاب آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ آپ بیتی چودہ (۱۴) ابواب پر مشتمل ہے۔ رضا علی بنیادی طور پر وکیل اور سیاست داں تھے، اس لیے ''اعمال نامہ'' میں بیک وقت سیاسی حالات اور ادبی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجموعی طور پر ''اعمال نامہ'' اردو ادب کی دلکش اور قابل تعریف خودنوشت ہے۔ یہ صرف رضا علی کا اعمال نامہ ہی نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ بھی ہے۔ اچھی خودنوشت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف نجی داستان نہ ہو بلکہ اس میں روح عصر کی تصویر جھلکتی ہو۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رضا علی نے اپنی آپ بیتی کے پردے میں ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، عملی اور مذہبی تاریخ بیان کردی ہے۔ وہ اپنی ذات اور ماحول کی عکاسی کرنے میں پوری طرح کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ عام قاری اس کتاب کو پڑھ کر اس عہد سے بخوبی واقف ہوسکتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے 'اعمال نامہ' ایک مکمل خودنوشت ہے۔

خون بہا حکیم احمد شجاع ۱۹۴۳ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ مصنف کی پچاس سالہ زندگی کی مرقع ہے۔ اسے تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے زیادہ تر صفحات میں نظم ونثر سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے میں کہیں تنہا نظر

Jawaharlal Nehru University Library
TH-12401

نہیں آتے۔اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔آپ بیتی میں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کو انہوں نے ترجیح دیا ہے۔ ہر جگہ اپنے دوستوں اور اساتذہ کو یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کتاب کی زبان واسلوب بڑی سادہ ودلنشیں ہے۔

حکیم احمد شجاع نے کسی قسم کا دعویٰ کیے بغیر سیدھے سادے انداز میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ان روشن کارناموں کا ذکر کیا ہے، جو ہندوستان کی قومی وسیاسی تاریخ میں نمایا حیثیت رکھتے ہیں۔اس آپ بیتی کی سب سے زیادہ متاثر کن خوبی ان کی انکساری اور ایک ایک لفظ سے جھانکتا ہوا ان کا خلوص ہے۔انہوں نے شعوری طور پر بیانیہ اور سنجیدہ انداز اختیار کیا ہے۔ان کی تحریر بڑی صاف، سستہ اور دلنشیں ہے۔''خون بہا'' میں خالص ادبی زبان واسلوب کو برتا گیا ہے۔اس کے باوجود یہ اپنی سادگی کی وجہ سے اردو کی اہم خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

میرا افسانہ چودھری افضل حق کے سیاسی و مذہبی افکار کی داستان حیات ہے۔جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے چند گوشوں کو بڑی بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔انہوں نے سیدھے سادے انداز میں اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے کا ذکر کیا ہے۔اس میں انہوں نے اپنے مدرسہ وملازمت کے حالات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔اس میں مدرسہ کی تعلیمی نظام اور اساتذہ کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔اس کے علاوہ اس میں ملکی حالات کی کشاکش اور قومی وسیاسی معاملات کی جدوجہد کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے جس سے ہمیں اس دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی حالات ومسائل کا اندازہ ہوتا ہے۔سیاسی ومذہبی خودنوشت ہونے کے باوجود اس کے اسلوب پر ادبی رنگ غالب ہے۔اس آپ بیتی میں ایک مخصوص دور کی عکاسی ملتی ہے۔

ذاتی ڈائری مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۴۹ء کی آپ بیتی ہے۔یہ کتاب خودنوشت سے زیادہ بطور سفر نامہ مقبول ومعروف ہوئی۔مولانا ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں اسلام کی طرف راغب ہوگئے۔ان کے شوق نے کم عمری ہی میں اسلام قبول کروادیا تھا۔اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے۔'ذاتی ڈائری' ایک تاریخی دستاویز ہے۔اوران حالات پر مشتمل ہے جو مولانا کو شیخ الہند کی جماعت کے ایک رکن کی حیثیت سے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک کابل میں پیش آئے۔انہیں سارے حالات وواقعات کو اس میں قلم بند کیا

گیا ہے۔

یادایام نواب احمد سعید خاں چھتاری ۱۹۴۶ء کی آپ بیتی ہے۔اس آپ بیتی سے مصنف کی زندگی کے حالات کے پس منظر میں اس دور کے سیاسی اور سماجی صورت حال ابھر کر آتے ہیں۔اس میں ان کے گھریلو زندگی کا عکس جابجا نظر آتا ہے۔چونکہ نواب چھتاری انگریز دور حکومت میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔اس لیے یہ خودنوشت سیاسی خودنوشتوں میں خاصی اہمیت کے حامل ہے۔مصنف کا اسلوب بیانیہ اور زبان بے تکلف اور سادہ ہے۔نواب چھتاری کی شخصیت ہندوستان کی آزادی اور وطن کے دیگر مسائل کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔جس کا ثبوت ہمیں اس خودنوشت میں ملتا ہے۔

مابدولت شوکت تھانوی ۱۹۴۶ء کی آپ بیتی ہے۔اس میں مصنف نے صرف اس دور تک کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے جن کا تعلق صحافت نویسی سے تھا۔لیکن مصنف کی کوشش یہ بھی ہے کہ زندگی کے تمام اہم اور نمایاں واقعات اس میں آجائیں۔شوکت تھانوی بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔وہ بعض اوقات چند مختصر مزاحیہ جملوں میں شخصیت کا بڑا اچھا نقش پیش کردیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی بھی اسی انداز میں لکھی ہے۔بچپن کی شرارتوں،تعلیم وتربیت،گھریلو حالات اور ماحول کا ذکر بھی پرلطف انداز میں کیا ہے۔

اس میں شوکت تھانوی کے بچپن سے لے کر صحافتی دور تک کے نشیب وفراز اور سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔محمد عمر سے لے کر شوکت تھانوی تک انہیں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا ہے ان تمام واقعات کی تفصیل دلچسپ اور دلکش انداز میں کیا ہے۔یہ اردو کی اہم خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

نقش حیات محمد حسین احمد مدنی ۱۹۵۳ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔اس کی بنیاد اخلاق آموزی،اصلاح قوم،سیاسی واقعات کی تفصیل اور خارجی حالات پر رکھی گئی ہے۔اس آپ بیتی میں صرف مولانا کی سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے اقتدار کے خاتمے تک کے نمایا واقعات کا ذکر ہے۔اس کتاب میں برطانوی حکومت کی تباہ کن ڈپلومیسی اور سیاسی مکروفریب کا جائزہ لیا گیا ہے۔مولانا ایک گوشہ نشیں،خداپرست بزرگ اور صوفی وجید عالم تھے۔ہنگامی زندگی سے انہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔لیکن جنگ آزادی کی تحریک میں انہوں نے نمایا رول ادا کیا تھا۔

مولانا نے اس کتاب میں ایک سو چار (۱۰۴) عنوانات قائم کیے ہیں۔ کم وبیش ہر جگہ انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد کا تذکرہ حاوی ہے۔ اس میں بچپن، خاندان، تعلیم وتربیت سے لے کر آغاز شباب تک کے حالات وواقعات درج ہیں۔ شیخ الہند کی سوانح عمری کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی رجحانات وانقلابی تحریکات کا اس خودنوشت سوانح کو مستند تذکرہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

سرگذشت عبدالمجید سالک ۱۹۵۴ء کی آپ بیتی ہے۔ سالک ایک بلند پایہ ادیب، خوش گو شاعر، مشاق صحافی اور اردو میں مزاحیہ کالم کے بانی تھے۔ 'سرگذشت' کی کچھ قسطیں 'امروز' اور باقی 'نوائے پاکستان' میں سلسلے وار چھپتی رہیں۔ ۱۹۵۴ء میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سالک کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان وپاکستان اور خصوصاً پنجاب کی سیاسی، مجلسی، علمی، ادبی، اور صحافتی رجحانات وتحریکات کی ایک طویل داستان ہے۔ وہ خود ان تحریکات میں شامل رہے۔ انہوں نے اس میں اپنے دور کے کئی مشہور ومعروف ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔

''سرگذشت'' میں بے شمار خوبصورت واقعے اور جملے ہمیں یکجا ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کی بے تکلف صحبتوں کے دلآویز نقشے ہیں۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں مصنف کی ذاتی حالات وواقعات کی تفصیلات کے قطع نظر اس میں ہمارے ملک اور خاص طور پر پنجاب کی چالیس سالہ علمی، سیاسی اور مجلسی زندگی کی اہم یادداشت ہے۔

مشاہدات نواب ہوش یار جنگ ۱۹۵۵ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ آپ بیتی ۲۱ عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس کا اصل موضوع حیدرآباد کی سیاست ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بچپن اور مذہبی مسلک پر بھی مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں حیدرآباد کی شکست وریخت اور اس وقت کے تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی حالات وواقعات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب سیاسی وتاریخی علوم سے بھی بہرہ ور ہے۔

شاد کی کہانی شاد کی زبانی مرتب مسلم احمد نظامی ۱۹۵۸ء کے مقدمے میں شاد عظیم آبادی کے سوانحی حالات ملتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی اپنے دور کے ایک عظیم شاعر گزرے ہیں جس کی یہ آپ بیتی ہے۔ یہ ایک نئے انداز کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جس کا مسودہ خود شاد عظیم آبادی نے تیار کیا لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ کتاب ان کے نام سے شائع ہو۔ اردو آپ بیتی میں اب تک کوئی ایسی خودنوشت نہیں ملتی جس کی اشاعت دوسرے کے نام سے ہوئی ہو۔ مقدمہ سے شاد عظیم آبادی کے حسب ونسب، خاندان، تعلیم وتربیت اور اس عہد کی معاشرتی وتہذیبی فضا کی تصویر

ہمارے سامنے آتی ہے۔ باقی صفحات شادؔ کی شاعری، تلامذہ اور ان کے نظم ونثر کے تبصرے پر مبنی ہے۔ مجموعی طور پر یہ خودنوشت سے زیادہ شادؔ عظیم آبادی کی علمی خدمات کے اعتراف میں لکھی گئی کتاب ہے۔ حالانکہ اس خودنوشت کا اردو ادب پر خاطر خواہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ناقابل فراموش دیوان سنگھ مفتونؔ ۱۹۵۸ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس خودنوشت کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ مفتونؔ نے اپنے حالات لکھنے کا سلسلہ اپنے مشہور پرچہ ''ریاست'' میں شروع کیا۔ آزادی کے بعد یہ کتابی صورت میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ مصنف نے جتنے واقعات بیان کیے ہیں ان میں صاف گوئی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مفتونؔ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے۔ انہوں نے فن صحافت میں بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکر لی ہے۔ ان کے پرچے سے راجا، مہاراجا اور والیان ریاست سب کانپتے تھے۔ ان کے محلوں میں جو کچھ بھی ہوتا مفتونؔ کے پرچے میں چھپ جایا کرتا تھا۔

مفتونؔ صاحب بڑی صاف گوئی سے رشوت کی گرم بازاری، پولیس اور حکومت کی چیرہ دستی، پالٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے راز، دیسی ریاستوں کے اسرار و مظالم، اخلاقی پستی اور غداری کے واقعات، خودغرضی و ہوس پرستی اور نمک حرامی وغیرہ کے حیرت انگیز واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا۔ اس طرح ان کی تصنیف حق و باطل، خیر و شر، ظلم و ستم اور بھلائی و برائی کا ایسا مرقع ہے جس سے انسانی فطرت کا مطالعہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

''ناقابل فراموش'' کی جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ مصنف کا واقعات سے نتائج اخذ کرنا ہے۔ پند و نصیحت کے اس انداز نے آپ بیتی کی دلکشی اور واقعات کے تسلسل کو مجروح کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مفتونؔ کی شخصیت کے درخشاں پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔

سحر ہونے تک آغا جان کاشمیری ۱۹۶۴ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ اردو میں ایک بے باک اور دلچسپ خودنوشت سوانح حیات کا نمونہ ہے۔ یہ کتاب دوٹوک کہنے کی اچھی مثال ہے۔ اپنے خاندانی حالات اور بچپن کے ایسے واقعات سے انہیں اپنے گنہگار ہونے کا احساس عمر بھر رہا، بے جھجک بیان کر دیتے ہیں۔ تھیٹر اور فلم آغا صاحب کی زندگی کے بڑے رنگین اور دلچسپ تجربے ہیں۔

آغا صاحب کا انداز بیان اور اس کی دلکشی تمام آپ بیتی میں یکساں ہیں۔ وہ جس واقعے کو بیان کرتے ہیں، تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ قاری کو اکیلا نہیں چھوڑتے، خواہ وہ لکھنؤ ہو یا بمبئی، کلکتہ

ہو یا رنگون، آغا صاحب ہر مقام اور ماحول کی تصویر اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ خودنوشت اردو کی سوانحی ادب میں نہ صرف ایک دلکش اضافہ ہے، بلکہ انوکھے انداز سے مرتب کی گئی آپ بیتی ہے۔ جس میں مصنف کوئی دعویٰ کیے بغیر خطرناک حد تک واقعات کو سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

میری دنیا ڈاکٹر اعجاز حسین ۱۹۶۵ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ایک شفیق استاد اور ادیب کی حیثیت سے اردو ادب میں جانے جاتے ہیں۔ آپ بیتی کا آغاز پیدائش اور بچپن کے حالات سے کرتے ہیں۔ گاؤں کی سیاسی اور سماجی حالات کا نقشہ بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ ان سارے دوستوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے۔ ملازمت سے لے کر ریٹائرمنٹ تک کا حال بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں بعض حضرات کے خاکے بھی ملتے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود شخصیت کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔

اس خودنوشت میں اپنی ذات سے زیادہ احباب، تلامذہ اور اساتذہ کی طرف توجہ ملتی ہے۔ اپنی ازدواجی زندگی کا تذکرہ سرسری طور پر کرتے ہیں۔ اعجاز صاحب اس میں اپنے تصورات، خیالات، رجحانات اور تاثرات کی دنیا کو پیش کیا ہے۔ دلکش یادوں کی بازیافت میں ان افراد اور تلامذہ کو بھی فراموش نہیں کیا ہے جن سے وہ بہت کم ملے ہیں۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی روایتوں، ادبی نشستوں، مجلسوں، مباحثوں اور مذاکروں کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

ایک اچھی آپ بیتی کے لیے تخلیقی زبان اور تخلیقی اسلوب ہونا چاہیے اور یہ دونوں چیزیں اس آپ بیتی میں موجود ہیں۔ اعجاز صاحب مبالغہ آرائی اور خودنمائی سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ آپ بیتی زبان و اسلوب کے لحاظ سے ایک اچھی آپ بیتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی دنیا میں اس خودنوشت کو اہم مقام حاصل ہے۔

یادوں کی دنیا یوسف حسین خان ۱۹۶۷ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یوسف حسین خان اردو کے نامور ادیب اور مؤرخ ہیں۔ وہ فن خودنوشت نگاری سے کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں اور انہیں استعمال کرنا جانتے ہیں۔ یہ آپ بیتی صرف ان کے ذات ہی تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے تفصیل کے ساتھ ہندوستان میں پٹھانوں کی آمد، سیاسی و سماجی پس منظر اور ان کے آباؤ اجداد کے متعلق معلومات فراہم کیا ہے۔ اسلوب بیانہ ہے۔ قیام فرانس کے دوران کے حالات اور

وہاں کے حسن وعشق کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یوسف حسین خان ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔اپنے خاندان اور ذاکر صاحب کی سیرت پر ایک باب الگ سے لکھا ہے۔ذاکر صاحب کو فخر خاندان بتایا ہے۔''پس منظر'' کے عنوان سے اس آپ بیتی میں اپنے آباؤاجداد کا ذکر کیا ہے۔بچپن کی یادیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اپنے وطن کی تعریف اس خودنوشت میں جابجا کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم ''یادوں کی دنیا'' کو اردو کی اچھی خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس میں تاریخ،ادب،نفسیات اور عمرانیات کا حسین متزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی تحریر میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے،مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے۔یہ آپ بیتی اپنی معلومات اور ندرت اسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔اظہار کی سادگی اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔

شاہراہ پاکستان چودھری خلیق الزماں ۱۹۶۷ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔یہ آپ بیتی سیاست کی ان دشواریوں سے گذرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے جن کے طے کرنے کے بعد تقسیم ہند کا واقعہ عمل میں آیا۔یہ کتاب پہلے "pathway of pakistan" کے عنوان سے انگریزی میں شائع ہوئی اس کے بعد اضافے کے ساتھ اسے اردو میں شائع کیا گیا۔یہ کتاب پوری ہندوستانی تاریخ ایک مخصوص دور کی آپ بیتی ہے۔چونکہ مصنف ایک صحافی تھے،اس لیے اس میں رپورٹنگ اسلوب وطرز تحریر کا رنگ غالب ہے۔اگر چہ یہ سیاسی تفصیلات کے ساتھ اپنے خاندانی حالات،علی گڑھ کی تعلیمی دور کے ہنگامے اور لکھنؤ کی معاشرتی فضا پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مگر انداز بیان سرسری ہے۔اس کا شمار بامقصد خودنوشت سوانح عمریوں کی فہرست میں ہونا چاہیے۔

یادوں کی بارات شاعر رومان اور شاعر انقلاب شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی ۱۹۷۲ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔جو زندگی کے آخری حصے میں مسلسل چھ(۶) سال کی محنت سے لکھی گئی ہے۔اس میں زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کی تصویر کشی،شخصیتوں کے ناتمام خاکے،تشبیہوں اور استعاروں کا برمحل استعمال،جملہ تراشی کے بے مثال نمونے اور لفظوں کے برمحل استعمال کا حسین منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔جوشؔ نے اپنی زندگی کے چار بنیادی عناصر بتائے ہیں۔شعر گوئی،عشق بازی، حصول علم اور انسان دوستی۔ان کی خودنوشت ان چاروں عناصر کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔

''یادوں کی بارات'' کے سلسلے میں جوشؔ نے ابتدا ہی میں اپنے حافظے کی کمزوری کا اعتراف

کرلیا ہے۔انہوں نے جس عمر اور جن حالات میں یہ آپ بیتی قلم بند کی ہے اس وقت حافظے کا قوی رہنا اور یادداشت کا اس طرح برقرار رہنا مشکل ہوتا ہے۔تقریباً پچہتر (۷۵) برسوں کے واقعات کو انہوں نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے اور پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔آپ بیتی میں اپنی خوبیوں، خامیوں، اپنے ماحول، فضا، خاندان، احباب، معاصرین اور معاشقوں کا بلاکم وکاست ذکر کیا ہے۔بعض واقعات سے انانیت اور خود پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔وہ ہمیشہ خواب وخیال کی دنیا میں بھٹکتے رہتے ہیں۔جو اس فن کو متاثر کرتی ہے۔جوش کا قلم جب حقائق وواردات کی تصویر کشی کرتا ہے تو الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ کی خودنوشت سوانح حیات اردو کی پہلی خودنوشت ہی نہیں بلکہ ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جس کی تعریف یا تنقیص پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے۔کسی چیز کے خلاف اتنی شدومد سے لکھا جانا اس بات کا نفسیاتی ثبوت ہے کہ مخالف اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے یا اس کی اہمیت سے خوفزدہ ہے۔''یادوں کی بارات'' کی بہت سی خامیوں اور مخالفتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو کی کوئی اور خودنوشت اتنی مقبول نہیں ہوئی اور نہ ہی اتنے زیادہ لوگوں کی نظروں سے گذری ہوگی۔یہ کتاب جب شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو خودنوشت سوانح نگاری کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت کو آگے بڑھانے میں ''یادوں کی بارات'' نے موثر کردار ادا کیا ہے۔اس سے متاثر ہوکر بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس صنف کی طرف توجہ کی اور اردو خودنوشت سوانح حیات کی دامن کو مالا مال کیا۔

مزدور منسٹر عابد علی کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو انقلاب پبلیشرز بمبئی کی شائع کردہ ہے۔مصنف کے آپ بیتی لکھنے کا خاص مقصد عوامی زندگی کے تجربات کی سرگذشت بیان کرنا ہے۔انہوں نے اس کتاب کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کیا ہے۔اسے ہندوستان کی عام بول چال کی زبان میں قلمبند کیا گیا ہے، تاکہ ہندی اور اردو جاننے والے عام قاری بھی اس کا مطالعہ کر سکیں۔اس آپ بیتی کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ عابد علی بچپن سے لے کر عمر کے آخر تک مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔اپنوں اور غیروں کے ظلم وستم اٹھائے، مگر حالات سے گھبرا کر انہوں نے راہ فرار اختیار نہیں کی۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں یہ خودنوشت عابد علی کی تجربات کا نچوڑ ہے۔اس میں افسانوی انداز نظر آتا ہے۔مصنف نے سیاسی اور عوامی زندگی کے ساتھ ساتھ ازدواجی وخانگی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے جو بہت ہی آسان، سادہ اور سلیس زبان میں ہے۔اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں

میں یہ آپ بیتی ایک دلکش اضافہ ہے۔

آشفتہ بیانی میری رشید احمد صدیقی ۱۹۷۲ء کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ یہ آپ بیتی ان کی جودت طبع اور ندرت اسلوب کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی طرز کے خود موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالب علم اور استاد کی حیثیت سے رہے۔ علی گڑھ سے انہیں بے انتہا عشق تھا۔ اس خودنوشت میں وہ اپنے اسی جذباتی لگاؤ اور عشق کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے طالب علموں کی سماجی زندگی، جذبۂ ایثار اور ان کے تہذیبی رویوں پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں علی گڑھ کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دوسری تحریروں کی طرح ان کی خودنوشت میں بھی شگفتگی اسلوب کی ندرت اور اشارتی انداز ان کا زیور ہے۔ اور یہی اشارتی انداز اس خودنوشت کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مکمل کتاب کا مطالعہ کرنے کے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارے عناصر اور معلومات جو ایک خودنوشت میں ہونا چاہیے اس میں اس کا فقدان ہے۔ جس کی وجہ سے یہ خودنوشت یک رخی اور نامکمل لگتی ہے۔ اگر یہ مکمل خودنوشت ہوتی تو اردو کی سوانحی ادب میں اسلوب اور ادبی معلومات کے بنا پر ایک اہم اضافہ ہوتا۔

مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں خواجہ غلام السیدین ۱۹۷۴ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ آپ بیتی کے دو حصے ہیں۔ پہلا ''مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں'' جو سید ین صاحب نے قلم بند کیا ہے۔ اور دوسرا حصہ ''ذکر جمیل'' کے نام صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے۔ اس میں سید ین صاحب صرف چالیس سالہ واقعات زندگی ہی مرتب کر پائے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔ آخر ان کی ہمشیرہ صالحہ عابد حسین نے اس آپ بیتی کو مکمل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے سید ین صاحب کے خطوط کی مدد سے عبارت میں تسلسل قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ بیتی نامکمل ہونے کے باعث سید ین صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے تھے اس لئے صالحہ عابد حسین نے ''ذکر جمیل'' لکھ کر اس کی تکمیل کی۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔

آپ بیتی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کو مصنف مکمل کرتا تو یہ ایک بہترین خودنوشت سوانح حیات ہوتی۔ لیکن نامکمل رہ جانے کے باعث وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور مختلف شخصیت کا تجزیہ مکمل نہ کر سکے۔ اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد انکساری، خلوص اور محبت پر رکھی گئی ہے۔ ان کی نظر میں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے عزیزوں، بزرگوں

اور کرم فرماؤں کی وقعت ہے۔انہوں نے اپنی ذات سے زیادہ دوسروں سے محبت کی ہے۔یہی سبب ہے کہ خود ان کا اپنا ذکر آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

ذکر جمیل میں صالحہ عابد حسین نے سیدین صاحب کے نجی حالات، محبت اور پر خلوص تعلقات کا تجزیہ کیا ہے۔جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں مصنف کو کمال حاصل ہے۔وہ ہر منظر کی تصویر بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودنوشت ایک اچھے انسان کی پر خلوص داستان حیات ہے۔جس میں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

اپنی تلاش میں کلیم الدین احمد ۱۹۷۵ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔کلیم الدین احمد اردو کے جانے مانے ادیب ونقاد ہیں ان کی تنقیدیں اور ان کے چونکا دینے والے جملے ان کے گرد انفرادیت کا ہالہ بناتے ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے نفسیات کے سہارے ان تمام عوامل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے جنھوں نے ان کی شخصیات کی تعمیر میں حصہ لیا۔اس آپ بیتی میں اپنے خاندان اور اس کے ماحول کے ساتھ ساتھ پٹنہ کی علمی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔شعر وشاعری، کبوتر بازی، پتنگ بازی، شطرنج اور تاش وغیرہ ایسے کھیل تھے جن کا اس وقت شرفا کے بچوں میں عام راوج تھا۔اس میں اس عہد اور سماج کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے۔

کلیم الدین احمد نے وہابی تحریک کو اپنی کتاب میں کافی جگہ دی ہے۔وہ موضوع سے ہٹ کر اکثر دور جا نکلتے ہیں اور یہ بے ربطی ان کی خودنوشت میں کم وبیش ہر جگہ موجود ہے۔خودنوشت مکالمہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی روداد سنا رہے ہیں۔انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا ہے اور وہاں سے سرسری طور پر گزر گئے ہیں۔

مصنف نے فن سوانح نگاری کے اصولوں کی روشنی میں آپ بیتی تحریر کی ہے۔گھریلو اور خانگی زندگی کے علاوہ اپنی فکری سفر پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔انہوں نے اپنے دور کا ذکر کم وبیش ہر جگہ کیا ہے۔اس آپ بیتی میں اس عہد اور سماج کا عکس دکھائی دیتا ہے۔اگر اس کے سارے حصے شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں تو یہ کتاب آپ بیتی کے روایت میں ایک بہترین اضافہ ہو سکتی ہے۔

جہان دانش احسان دانش ۱۹۷۵ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔احسان دانش اپنی زندگی میں جس نشیب وفراز سے گزرے، جن صعوبتوں اور پریشانیوں کا انہیں سامنا کرنا پڑا، اس

آپ بیتی میں اس کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ وہ اس خودنوشت میں سماج میں دبے، کچلے، غریب اور محنت کش عوام کے زندگی کی سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق خود اسی محنت طبقے سے تھا، اس لئے ان کے اظہار میں گرمی کے احساس کی شدت پائی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اپنے عہد کے شعری، ادبی اور لسانی نظریات کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''جہان دانش'' حقیقت نگاری اور شخصیت نگاری کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ اپنے ذاتی حالات پر برملا اظہار خیال کیا ہے۔ بعض ہندو مسلم دوستوں کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔ یہ آپ بیتی سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی ہے، جو مصنف کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بہت دلچسپ ہے۔ اعلیٰ قسم کی منظر نگاری اس میں ملتی ہے۔ مصنف بنیادی طور پر ایک شاعر ہے، اس لئے اس خودنوشت میں بعض اوقات اسلوب بھی شاعرانہ ہوگیا ہے، اور خوبصورت تشبیہات و استعارات عام قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

زرگذشت مشتاق احمد یوسفی ۱۹۷۶ء کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ یہ آپ بیتی مزاحیہ اسلوب اور فن کاری کی وجہ سے اردو خونوشت سوانح عمریوں میں نمایا مقام کی حامل ہے۔ اس میں مصنف نہ تو پوری طرح غائب ہے اور نہ پوری طرح حاضر۔ اس میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے دوستوں اور دیگر لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔

یوسفی نے اپنے مزاح سے خوب فائدہ اٹھایا ہے اور بڑے چپکے سے وہ بات کہہ گئے ہیں جنھیں سنجیدہ اسلوب میں کہا جائے تو پورا دفتر درکار ہو۔ ان کی آپ بیتی اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ان کے اسلوب ہی کی طرح منفرد ہے۔ اس آپ بیتی پر افسانوی رنگ غالب ہے۔

آپ بیتی مولانا عبدالماجد دریا آبادی ۱۹۷۸ء کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی داستان حیات ہے جو نہ صرف آپ بیتی کے فن سے پوری طرح واقف ہے بلکہ وہ زبان شناس بھی ہے اور اہل زمانہ کے مزاق سے بخوبی واقف ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں فن کو مکمل طور پر برتا ہے۔ مولانا ایک فقیہہ، مفسر قرآن اور ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ بعض ادیبوں اور شاعروں پر سوانحی مضامین بھی لکھے ہیں، جو بہت مقبول ہوئے۔ ان مضامین کے علاوہ چند سوانحی تصانیف بھی ہیں جن کا ذکر باب چہارم میں کیا ہے۔ ان سے مولانا کے ذوق سوانح نگاری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا نے اپنی خودنوشت اس وقت تصنیف کی جب ان کی عمر پچہتر (۷۵) سال تھی۔ اس طرح انہوں نے ساری زندگی کے جستہ جستہ واقعات کو اپنی آپ بیتی میں قلم بند کر دیا ہے۔ وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے قول و فعل کو بے تکلف بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اس آپ بیتی کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی زبان، اسلوب، سادگی، صفائی، وضاحت اور قطعیت لیے ہوئے ہے۔ مولانا نے اس آپ بیتی میں سیتا پور اور لکھنؤ کی علمی وادبی، معاشی وتہذیبی، مذہبی اور تاریخی فضا کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ آپ کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے تمام حادثات و واقعات، رجحانات، افکار و خیالات، خوبیوں اور خامیوں کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے خویش و اقارب، بزرگوں، دوستوں، معاونین اور مخالفین سبھوں کا ذکر بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ زبان و بیان اور فن کے لحاظ سے یہ اردو کی چند کامیاب خودنوشتوں شمار کی جاسکتی ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی خودنوشت میں ہونی چاہیے۔

ایک طالب علم کی کہانی عبدالغفار مدھولی کی تحریر کردہ ادھوری خودنوشت سوانح ہے۔ اس میں مصنف نے صرف اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ان کے قصبہ مدھولی، حیدرآباد کے رسم و رواج اور تہذیب کی واقفیت ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح حیات کا غالب رجحان تعلیم و تعلم سے ہے۔ اس میں تعلیم کے طریقے اور اساتذہ کے تربیت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ غریب ہونے کے باوجود تعلیم نے انہیں حیدرآباد سے علی گڑھ لے آتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ خودنوشت اسلوب کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہے۔ نثر میں زبان کی شگفتگی اور محاورہ کی چاشنی کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس میں جذبہ کی گہرائی کا فقدان ہے۔ اکثر مقامات پر مکالمہ نگاری کا انداز اپنایا گیا ہے۔ معلم ہونے کی وجہ سے سیدھا سادہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب کو کہانی، ڈرامہ اور اسباقی زبان کے عناصر سے مزین کرنے کی کوشش کی ہے۔

لطیف کی کہانی عبداللطیف بجنوری کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی سیاسی وسماجی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ان کو ہندوستانی عوام اور یہاں کی ثقافت کی خدمت کسی بھی قیمت پر عزیز تھی۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کی تفصیل اور اس دور کی

سیاسی کشمکش کا حال بیان کیا ہے۔ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو اس کا جائز حق دلانا چاہتے تھے۔ ان کی تحریر میں حقیقت اور سچائی کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی خودنوشت صرف ان سیاسی زندگی کی داستان ہے جس کے ذریعے ان کی سیاسی بصیرت اور سیاسی تگ ودو تک رسائی حاصل ہوسکتا ہے۔ میدان سیاست میں جو کام انہوں نے انجام دیا اس کی پوری تفصیل اس آپ بیتی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خودنوشت کو ایک تاریخی دستاویز بھی کہہ سکتے ہیں جس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

لاہور کا جو ذکر کیا گوپال متل کی یادوں کا سلسلہ ہے، جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں شامل ہیں۔ بلکہ اسے آپ بیتی نہ کہہ کر صرف چند تاثرات کا مجموعہ کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس میں ۱۹۳۲ء سے لے کر ملک کے تقسیم ہونے تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ دوستوں کے خاکے بھی ملتے ہیں۔ گوپال متل پنجابی ہونے کے باوجود ٹکسالی زبان کا استعمال خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب بیانیہ ہے۔ اس میں ادبی زبان کا استعمال ہوا ہے۔ حقائق کو سچائی اور بے باکی سے بیان کرتے ہوئے گوپال متل نے اس کتاب میں اس دور کی سیاست پر روشنی ڈالی ہے۔ سلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال ہے۔ اس کتاب میں اہل خاندان کے کسی بھی افراد کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس آپ بیتی کو ہم نیم ادبی، سیاسی وسماجی خودنوشت کہہ سکتے ہیں۔

گرد راہ اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی ستر (۷۰) برس کی زندگی کو بیس (۲۰) مختلف ابواب میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ اس میں بچپن سے لے کر خودنوشت تحریر کرتے وقت تک چند واقعات کو چھوڑ کر سارے واقعات وحادثات کا احاطہ بڑی کو خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے آباواجداد کا تذکرہ، اپنے بچپن کی یادیں، تعلیمی زندگی، ملازمت اور ملازمت کے دوران مختلف ممالک میں یونیسکو (UNESCO) کے سفیر کی حیثیت سے کام کیا اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ ان سب کا ذکر اس آپ بیتی میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودنوشت تخلیقی، لسانی اور اسلوبی خصوصیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ اپنے عہد اور مصنف کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اسے ادبی اور سیاسی خودنوشت سوانح عمریوں میں اہم مقام حاصل ہے۔

گفتنی ناگفتنی وامق جونپوری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ وامق تمام عمر شاعری کرنے بعد نثر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ خودنوشت سیاسی وسماجی افکار کی آئینہ دار ہے۔ اس

میں انہوں نے مشاعرے، سیاسی وسماجی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اپنے عہد کی ترقی پسند ادبی تحریک، اس کے مقاصد اور نتائج پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات بھی اس میں ملتے ہیں۔

وامق نے ہندوستان کی تہذیبی، سیاسی وسماجی زندگی میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ یہ آپ بیتی ان کی ذاتی زندگی کے حالات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ یہ خودنوشت زبان واسلوب اور فن کے لحاظ سے ایک عمدہ آپ بیتی ہے۔ اسلوب کی شگفتگی اور مواد کی اہمیت کی وجہ سے یہ اردو کی بہترین خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

مٹی کا دیا میرزا ادیبؔ کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت میں میرزا ادیب کی تقریباً ستر (۷۰) سالہ زندگی کی روداد بیان ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ پورا دور ایک انقلاب کا دور رہا ہے۔ اس دور میں رہنے والا ہر شخص نہ ان تبدیلیوں کا تماشائی رہا، بلکہ ان تماشوں میں وہ برابر کا شریک بھی رہا۔

اس خودنوشت کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ میرزا ادیبؔ نے اس میں کہیں بھی گلیمرائز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ واقعات کو سلیس اور عام زبان میں اس طرح بیان کیا ہے جیسے وقوع پذیر ہوئے۔ پوری آپ بیتی پڑھنے کے بعد قاری کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسے ادیب کی سوانح پڑھ رہا ہے جس کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، بلکہ یہ اس عام غریب خاندان کے ایک فرد کی داستان ہے جس نے اپنی محنت لگن اور صلاحیت کے بل بوتے پر نا مساعدات حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنا مقام خود پیدا کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں ''میرے ہمدم میرے دوست'' کے عنوان سے انہوں نے اپنے ہمعصر اہل قلم حضرات کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے جن کا تعلق ان کے ذاتی تاثرات سے ہے۔ ان خاکوں میں غلام عباس، عصمت چغتائی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، کنہیا لال کپور، مشفق خواجہ، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، حافظ محمود شیرانی، آغا حشر کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور عبدالرحمٰن چغتائی وغیرہ ہیں۔ اور بحیثیت مدیر جن رسالوں میں کام کیا اس کی تفصیلات کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو میں جن حضرات سے تعلقات رہے ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی طبیعت میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بعض اوقات مکالموں سے کام لیا ہے جو اردو آپ بیتی میں کمیاب ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودنوشت اپنے عہد اور مصنف کے احوال کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تحریکوں اور مصنف کے اپنے ادبی نقطۂ نظر کو بخوبی پیش کرتی ہے۔ ادبی خودنوشت سوانح عمریوں میں اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔

آپ بیتی ظفر حسن ایبک کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔اس میں سفر نامے کا لطف ہے اور فوجی معرکوں کی دلچسپی بھی۔اس کتاب کے دو حصے دستیاب ہیں۔پہلے حصے میں اپنے بچپن اور زمانے کے سیاسی وسماجی حالات بیان کئے گئے ہیں۔دوسرے حصے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی روس، افغانستان اور ترکی کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔چونکہ اس میں سفر نامے کا بیان زیادہ ہے اس لیے اسے آپ بیتی اور سفر نامے کی درمیانی چیز بھی کہہ سکتے ہیں۔

آپ بیتی کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ہے۔مصنف کا مقصد اصل واقعات کا بیان کرنا ہے۔اس لیے آپ بیتی میں عبارت آرائی اور رنگین بیانی سے احتراز کیا گیا ہے۔اس آپ بیتی کا اسلوب سادہ مگر پر اثر ہے۔

یادوں کے سائے عتیق احمد صدیقی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔اس خودنوشت میں ان کی پوری زندگی، تعلیم، والدین اور دیگر ضروری امور کا عکس نظر نہیں آتا۔اس پر سیاسی حالات وفضا کا غلبہ ہے۔ان کی تحریر میں تشبیہ واستعارے کا عمل نظر آتا ہے۔انہوں نے عام بول چال کی زبان کا استعمال کیا ہے۔اسلوب کی شگفتگی نے ناول اور افسانے کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔یہ خودنوشت یک رخی اور نامکمل ہے۔لیکن پھر بھی اسلوب کی شگفتگی اور مواد کی اہمیت کے لحاظ سے اردو کی اچھی خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

آزادی کی چھاؤں میں بیگم انیس قدوائی کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو ۱۹۴۷ء کی خونی واقعات پر مشتمل ہے۔اس میں وہ سارے مواد مل جاتے ہیں جسے ایک ادب یا تاریخ کے طالب علم کو ضرورت پڑتی ہے۔انہوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات ومحرکات پر خوبصورتی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔اس کا انداز بیانیہ ہے۔اسلوب دلکش اور بول چال کی زبان سے قریب ہے۔مصنف کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔یہ خودنوشت ایک مخصوص دور کی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔زبان واسلوب کے نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو کی اعلیٰ خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

بوئے گل دل دود چراغ محفل شورش کاشمیری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔شورش کاشمیری نے اپنی حالات زندگی چار کتابوں میں قلم بند کیے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے۔ان چاروں کی حیثیت آپ بیتی کی حیثیت ہے۔اس آپ بیتی میں مصنف نے اپنے اردگرد کے ادبی ماحول کو اور ادبی صحبتوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔بالخصوص لاہور کی ہر

قابل ذکر ادبی شخصیت اور ادبی جریدے کا ذکر کیا ہے۔ان کی زندگی میں ادب اور سیاست دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں،لیکن سیاست ادب پر حاوی ہونے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔شورش بہت اچھے خطیب تھے۔اپنی سیاسی زندگی کے تجربات اور رجحانات کا ذکر کھلے دل سے کیا ہے۔اس خودنوشت میں ایک دلآویز کشمکش دکھائی دیتی ہے۔

ذہنی نشو نما اور ذہنی ارتقا کے موضوعات ایسے ہیں جنھیں انگریزی میں جدید رجحان کے بموجب آپ بیتی کی سب سے نمایا خصوصیت سمجھا جاتا ہے، اگر اس زاویئے سے دیکھا جائے تو شورش کاشمیری نے اردو ادب میں اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھ کر ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ان کی نثر بڑی دلنشیں اور پرتاثیر ہوتی ہے۔اس آپ بیتی کا شمار اردو کی بہترین خودنوشت سوانح عمری کی ذاتیاتی تحریر میں ہونی چاہیے۔

ایک ایکٹریس کی آپ بیتی اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن ''بملا کماری'' کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔اس آپ بیتی میں بچپن کے حالات نہ بیان کر کے اس آپ بیتی کی ابتدا کالج کے داخلے سے ہوتا ہے۔اس میں اس دور کے عام زندگی اور بالخصوص کالج کی عام زندگی کا ایک ہلکا سا عکس نظر آتا ہے۔مصنف کی توجہ زیادہ تر اپنی ذات پر رہتی ہے۔خاص کر ذاتی زندگی کے اس حصے پر جہاں پر ایک مجبور لڑکی کا سماج کے پیشہ ور عیاش کس طرح استحصال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اس دور کے تھیٹروں اور فلمی زندگی کی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ خودنوشت فنی اعتبار سے نامکمل ہے۔اور زندگی کے صرف ایک حصے پر روشنی پڑتی ہے۔اس دور کی معاشرتی اور تہذیبی حالات کی جھلکیاں نہ ہونے کے برابر ہے۔اس آپ بیتی کا انداز بیانیہ ہے۔لیکن اتنا سادہ اور پرکشش و دلکش کہ عام قاری ایک بار کتاب ہاتھ میں اٹھالے تو بغیر پڑھے نہیں چھوڑتا۔اس کا اختتام شوہر اور بیوی کے وصال پر ہوتا ہے۔زبان بہت سادہ اور آسان ہے۔روزمرہ کی زبان کا استعمال ملتا ہے۔زبان واسلوب کے لحاظ سے یہ آپ بیتی کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہے۔

ہم سفر اختر حسین رائے پوری کی اہلیہ حمیدہ اختر کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔جس میں اپنے شوہر کے ساتھ گذارے ہوئے ایک ایک لمحے کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔چونکہ شوہر ممتاز ومعروف ناقد وصحافی تھے۔اور ان کے تعلقات ملک کے بڑے بڑے ادیبوں اور سیاست دانوں سے تھے اس لیے اس میں بار بار ان لوگوں کا ذکر کرتی ہیں۔مصنفہ نے ان لوگوں کے کارنامے بڑی

سادگی، سچائی اور بغیر کسی بناوٹ کے پیش کردی ہیں۔ کبھی کبھی یہ آپ بیتی سے جگ بیتی بھی بن جاتی ہے، جو ایک خودنوشت سوانح کا وصف ہے۔ اس کتاب کو حمیدہ اختر نے پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ عام بول چال کی زبان میں پیش کردیا ہے۔

یہ خودنوشت کردار اور ادوار کے اعتبار سے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ مکر وفریب کے اس دور میں جھوٹ اور مبالغہ سے پاک یہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر سچائی، ایمانداری اور سادگی کی مہر لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ آپ بیتی اردو خودنوشت سوانح نگاری میں ایک اچھی کوشش ہے، جو اردو ادب میں کافی اہمیت کے حامل ہے۔

یادوں کے چراغ اختر انصاری کی ایک نامکمل خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ آپ بیتی سلسلے وار مضامین کی شکل میں 'نیا دور' (کراچی) میں شائع ہوتی رہی۔ مگر بعض وجوہات کے بنا پر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اس آپ بیتی میں اختر انصاری کی زندگی کے کچھ خاص گوشے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس میں انہوں نے اپنی خامیوں اور کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالا ہے اور نہ ہی ان کا ذکر معیوب سمجھا ہے بلکہ بلا جھجک اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی معمولی سے معمولی کمزوریوں کو بھی بڑے پر لطف انداز میں بیان کرتے ہیں، جس سے افسانوی دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ آپ بیتی ان کی افسانوی تکنیک سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے مصنف کی شخصیت اور سیرت کے کئی اہم پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔

'یادوں کے چراغ' بظاہر ایک ادھورا سوانحی خاکہ ہے۔ لیکن اس کے ذریعے اختر انصاری کی زندگی کے کچھ اہم اور دلچسپ پہلو اجاگر ہوکر سامنے آتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور افادیت واضح ہوجاتی ہے۔ یہ اپنے ادبی اور تمثیلی پیرایۂ بیان، اسلوب اظہار کی شگفتگی اور اچھوتا پن سے متاثر کیے بنا نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسا خوبصورت ادب پارہ ہے جس کی دستاویزی اہمیت مسلم ہے۔ یہ آپ بیتی نامکمل ہے اگر یہ خودنوشت مکمل ہوجاتی تو اردو کے ادبی سرمائے میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہوتا اور اس کی ادبی اہمیت اور بڑھ جاتی۔

حواشی

۱:۔آکسفورڈ انگلیش ڈکشنری، جلد اول، باردوم، آکسفورڈ، ۱۹۷۰ء، ص ۸۰۱،

۲:۔عبداللہ، سید، اصناف ادب نمبر، پاکستان، نگار، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۹

۳:۔مہدی، ڈاکٹر مظہر، بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب (مضمون)
مشمولہ، بیسویں صدی اردو ادب، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۳۳

۴:صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، ۱۹۸۲ء، ص، ۳۱

۵:۔احمد، ڈاکٹر طفیل، آپ بیتی نمبر، لاہور، نقوش، ۱۹۶۴ء ص ۳۰۲

۶:۔انسائیکلو پڈیا برٹانیکا شکاگو، جلد دوم، ۷۴۔۱۹۷۳ء ص ۱۰۰۹
اردو ترجمہ راقم الحروف

۷:۔تاثیر، محمد دین، ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتون)، دہلی، پبلیشر دیوان سنگھ، ۱۹۵۷ء، ص ۴

۸:۔ایضاً، ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتون)، دہلی، پبلیشر دیوان سنگھ، ۱۹۵۷ء، ص ۵

۹:۔مہدی، ڈاکٹر مظہر، بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب (مضمون)
مشمولہ، بیسویں صدی میں اردو ادب، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۲ء، ص، ۳۳۵۔۳۳۶

۱۰:علوی، وہاج الدین، اردو میں خودنوشت: فن و تجزیہ، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء، ص ۴۱

۱۱:۔خاں، یوسف حسین، یادوں کی دنیا (دیباچہ) اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۶۷ء، ص ب

۱۲:۔سپرو، سر تیج بہادر، یادایام (نواب چھتاری) علی گڑھ، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۴۹ء، ص مقدمہ

۱۳:۔سالک، علیم الدین، آپ بیتی نمبر، لاہور، نقوش، ۱۹۶۴ء، ص ۵۴

۱۴:۔علوی، وہاج الدین، اردو میں خودنوشت۔فن و تجزیہ، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸۱

باب دوم

اردو شعرا کی خودنوشت سوانح حیات

یادوں کا جشن: (۱۹۸۳ء) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

''یادوں کا جشن'' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس آپ بیتی کے ذریعے مصنف نے اپنی چوہتر (۷۴) سالہ زندگی کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ کنور صاحب ایک ایسے جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے جسے مذہبی تقدّس حاصل تھا، اور دنیاوی امتیاز بھی۔ ان کی ابتدائی زندگی ناز ونعمت میں بسر ہوئی۔ لاہور کے چیفس کالج میں تعلیم پائی اور والد کے کہنے پر I.A.S کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنی محنت اور ایمانداری سے مختلف سرکاری عہدوں پر زندگی کے وہ تجربات حاصل کیے جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ طبعاً بہت مجلسی، ملنسار، ایماندار، دیانتدار اور خوش باش انسان تھے، اور اپنی فطرت کے عین مطابق ''یادوں کا جشن'' میں انہوں نے اپنے ماضی کو جشن کے مانند منایا ہے۔ یہ آپ بیتی کنور صاحب کی نجی زندگی کی عکاسی تو کرتی ہی ہے اس کے علاوہ ہماری سماجیاتی تاریخ کی ایک ایسی دستاویز ہے جس میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے کے بعد

ہے۔اوراس زمانے کے سیاسی تناؤ کے اسباب بھی روشن ہونے لگتے ہیں۔

''یادوں کا جشن'' ایک اعلیٰ ادیب اور ایک باغ و بہار کے شخصیت کے ایسے تاثرات ہیں جس سے مشترکہ تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔یہ ایک شخص کی داستان حیات نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ ہے،جس میں اس عہد کی سیاسی،سماجی،معاشی اور تہذیبی حالات کا ذکر ملتا ہے۔یہ آپ بیتی بیسویں صدی کے دوتہائی حصے کا احاطہ کرتی ہے۔اوراس کتاب کا انتساب ''ہندو پاک دوستی'' کے نام کیا گیا ہے۔

''یادوں کا جشن'' ایک ایسی دلچسپ آپ بیتی ہے جسے ایک بار کوئی پڑھنا شروع کرتا ہے تو ختم کیے بغیر نہیں رہتا۔اس آپ بیتی کی خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کی ہر سطر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔اس میں اختصار اور بیان میں روانی ہے۔زندگی کی رنگارنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ جسے ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔اس میں حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے۔کنور صاحب نے عملی سیاست کے میدان میں کبھی قدم نہیں رکھا،مگر کانگریسی اصولوں اور نظریوں کا انہوں نے ہمیشہ ساتھ دیا۔انتخابات کے موقعوں پر انہوں نے ہمیشہ کانگریس کی کامیابی کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔

''یادوں کا جشن'' میں کنور صاحب نے اپنے دور کے بعض ایسے اکابرین کا ذکر کیا ہے،جنہیں انہی کی مانند اپنے مخصوص تہذیبی رکھ رکھاؤ کا پورا پاس تھا۔اس کے علاوہ ان شخصیتوں کا بھرپور ذکر بھی ہے جن لوگوں کو انہوں نے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ان کے قلم نے ان لوگوں کے ذکر کو ایسے لفظی خاکوں کی شکل دی ہے کہ ان کے ظاہری خدوخال ہی نہیں بلکہ ان کے افتادمزاج کو بھی پہچانا جا سکتا ہے۔اس آپ بیتی میں انہوں نے اپنے دوستوں کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔مثلاً،سرعمر حیات خاں ٹوانہ،سرسکندر حیات خاں،نواب سعید احمد چھتاری،اوم پرکاش،جوشؔ ملیح آبادی،مینا کماری،محمد رفیع،مہاراجہ بھوپندر سنگھ وغیرہ سے ان کے خاص روابط تھے اوران کے خاص دوستوں میں سے تھے۔یہ ہستیاں ان کی زندگی میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

کنور صاحب نے اپنی آپ بیتی میں دلچسپ عنوان کے تحت ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو ہمیں ان دنوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔مثال کے طور پر کئی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔جیسے گوشۂ تنہائی،آلۂ واردات،بے اعتدالی،وضعداری اور جوشؔ ملیح آبادی نے سفارش کی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جس کے مطالعے سے ہمیں اس دور کے حالات و واقعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

کنور صاحب اس آپ بیتی میں دعوی کرتے ہیں کہ وہ شراب کے عادی نہیں ہیں، اور ان کا یہ دعوی بے جا نہیں ہے، کیونکہ وہ بادہ پرست ہیں شراب خور نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شراب خوری رسوائی حاصل کرنے کا نام ہے اور بادہ پرستی شراب سے لطف اندوز ہونے کو کہتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں شراب کا عادی نہیں ہوں۔ بعض اوقات مہینوں ہر شام پیتا ہوں لیکن احباب کے ساتھ، تنہائی میں کبھی بھی شراب کی جانب مائل نہیں ہوا، البتہ اگر کہیں مشاعرہ میں جانا ہو یا کہیں کوئی تقریر کرنا ہو تو اپنے ساتھ کچھ رکھ لیتا ہوں تا کہ مشاعرہ یا تقریر سے پہلے ایک دو پیگ لے لوں اور دو گھونٹ پی لوں تو تقریر بھی اچھی کر لیتا ہوں اور مشاعرہ کی نظامت یا صدارت یا محض شمولیت میں بھی جان سی پڑ جاتی ہے''۔[1]

کنور صاحب کو سیر و شکار سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ اس کے علاوہ راگ رنگ کی محفلوں سے بھی شغف رہا ہے۔ انہوں نے کشتیوں کے دنگل کرائے، مرغوں کے مقابلے، بٹیر بازی اور پتنگ بازی میں ذوق و شوق سے شریک ہوئے، اور جب ایسی رنگا رنگ شخصیت اپنی داستان سنائے تو اس میں جگ بیتی کا رنگ آجانا قدرتی بات ہے۔ شکار کا شوق ان کے خون میں شامل تھا اور ان کے خاندان میں کئی افراد شوٹنگ میں چمپین بھی رہے ہیں اور کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک کے شکاری کنور صاحب کے والد سے سیر و شکار کے لیے رجوع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا خاندان باز کے شکار کے لیے بھی مشہور تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''شیر کا شوق ہمارے خاندان میں پشتوں سے ہے۔ شکار کرنا ہمارے خون میں رچا ہوا ہے، یہاں تک کہ ہمارے خاندان کے بچے ہوش سنبھالتے ہی بندوق کی مانگ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے تین بھائی، ایک چچازاد بھائی اور میرا بیٹا اپنے اپنے وقتوں میں کل ہند مقابلے میں شوٹنگ چمپین رہے ہیں''۔[2]

باز کے شکار میں ان کے والد چمپین تھے جنھوں نے اس کو ایک فن کا درجہ دیا تھا۔ ان کا خاندان ہندوستان و پاکستان کے علاوہ سعودی عرب میں بھی شکار کے لیے مشہور تھا۔ سعودی عرب

کے شہزادے شکار کھیلنے کے لیے جب بھی ہندوستان آتے تو ان کے والد صاحب یا کنور صاحب سے رجوع کرتے تھے۔ کنور صاحب لکھتے ہیں:

> ''بندوق کے شکار کے علاوہ ہمارا خاندان ہندوستان و پاکستان میں باز کے شکار کے لیے مشہور ہے، یہاں تک کہ سعودی عرب کے شہزادگان جب بھی بھارت آئے تو انہوں نے آنے سے پہلے ہی مجھ سے رابطہ قائم کیا۔''[۳]

کنور صاحب شعر و شاعری کے رسیا ہیں خود بھی شعر کہتے اور سحرؔ تخلص فرماتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت سادہ مگر پرکار ہے۔ واقعات کے بیان میں وہ عبارت آرائی سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ جیسا کچھ دیکھا یا محسوس کیا یا جو کچھ پیش آیا اسے تکلف سے عاری سادہ الفاظ میں بیان کر دیا۔ طرز تحریر کی یہ بے تکلفی اور سادگی اس بات کی ضامن ہے کہ لکھنے والا جن واقعات کا ذکر کر رہا ہے ان کی اصلیت اور اثر انگیزی کا اسے علم ہے۔

کنور صاحب ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور شاعر نواز بھی۔ انہوں نے سیکڑوں مشاعروں کی محفلیں سجائی ہیں اور ملک اور دوسرے ممالک میں سیکڑوں مشاعروں کی صدارت یا نظامت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ مشاعروں میں شرکت کے لیے انہوں نے کبھی معاوضہ نہیں لیا، لیکن دوسرے شعرا کو مشاعروں کے وسیلے سے اور دوسرے ذرائع سے مالی فائدہ پہنچانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ کنور صاحب ہر محفل کی جان اور روح رواں ہوتے تھے۔

کنور صاحب جس محفل میں موجود ہوں اس کی کامیابی یقینی بن جاتی تھی۔ مشاعروں کی نظامت تو انہوں نے بے شمار فرمائی ہے، لیکن بہت کم مشاعروں میں شروع سے آخر تک رہے ہوں۔ اپنے پسندیدہ شاعر کو سنتے اور کوئی خوبصورت سا بہانا بنا کر چلے جاتے تھے۔ ایک جگہ مشاعرے اور مشاعرے کے اہتمام کرنے والوں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''مشاعرے سے بے شک ادب کی خدمت ہوتی ہے۔ اچھے شعرا کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور یہ مشاعرے عوام کے لیے تفریح کا سبب بھی ہوتے ہیں۔ مشاعروں کا اہتمام کرنے والوں کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو واقعی مشاعرے کے ذریعے ادب اور ادیبوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو محض واہ واہ کرانے اور اپنے

بارے میں یہ رائے قائم کرانے کے لیے کہ اہالیان شہر کے
لیے تفریح کا اہتمام کرتے رہتے ہیں، مشاعرے کراتے
ہیں۔ تیسری قسم ان ناکام شاعروں یا ادیبوں کی ہوتی ہے جو
کسی صاحب حیثیت صدر یا سرپرست کو پھانس کر مشاعرہ
کمیٹی کے صدر یا کنوینر بن جاتے ہیں اور شعرا سے خط
وکتابت کر کے رسم وراہ پیدا کرتے ہیں تا کہ وہ لوگ بھی انہیں
اپنے مشاعرے میں مدعو کریں'' ۴

''یادوں کا جشن'' میں کنور صاحب کی طبیعت کے تین رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ سیرو شکار، انسان دوستی اور ادبی مشاغل۔ اس آپ بیتی میں تینوں رجحانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنے بچپن اور ذاتی حالات کا ذکر انہوں نے بہت کم کیا ہے، صرف خاندان کے چند بزرگ اشخاص کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے عہد کے ان تمام لوگوں کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اس عہد میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اہل دہلی اور دہلی کی ادبی اور نیم ادبی محفلوں اور مشاعروں کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ دہلی کی سماجی وادبی زندگی کی تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اس میں ادبی فضا اور ادبی اصحاب کا حال پوری طرح دکھائی دیتا ہے۔ سماجی و سیاسی زندگی کی صورت حال کا تذکرہ بڑی بے باکی اور حقائق کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے اقتصادی اور معاشرتی زبوں حالی کا بھی ذکر کیا ہے۔

''یادوں کا جشن'' ایک ایسے شخص کی یادوں کا مجموعہ ہے جس نے اس برصغیر کی تاریخ کے ایک کربناک اور نازک دور سے گذرنے کے باوجود انسان دوستی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے دلچسپ واقعات و حالات کو جس جوش وصداقت اور دیانت داری کے ساتھ قلم بند کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس میں ان کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد کے شکاری کارنامے کا ذکر حیرت انگیز ہی نہیں، قابل فخر بھی ہے۔ اس آپ بیتی میں کنور صاحب نے جگہ جگہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔

کنور صاحب کی خودنوشت لطافت آمیزی، سادگی اور برجستگی کا نمونہ ہے۔ اس میں شعرو شاعری، شکار وشباب اور شراب کے تذکروں کے علاوہ اور بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے سیرت وکردار کی ستم ظریفیوں اور انسانی فکرونظر کی بوالعجبیوں کی مکمل تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے بیان میں نہ مبالغہ ہے اور نہ تحریف۔ جو واقعہ جس طرح پیش آیا ہے اسے بے

تکلفی کے ساتھ اسی طرح پیش کر دیا ہے۔خودنوشت کا تقریباً آدھا سے زیادہ حصہ اشخاص کے خاکوں، واقعات اور لطائف سے بھرا ہوا ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی خودنوشت سوانح حیات ہے جو کنور صاحب کی چوہتر (۷۴) سالہ زندگی کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہے۔اس کا اسلوب بیان سادہ اور سلیس ہے۔اپنی بات کو کنور صاحب بول چال کی عام زبان میں پیش کرتے ہیں۔الفاظ عام فہم مگر معیاری ہیں۔سیدھے سادے انداز میں اپنا مدعا بیان کر دیتے ہیں۔پر تکلف اور رومانی نثر کی جگہ نثر عاری کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔اس خودنوشت میں دلچسپی اور کشش کا سبب اس کی زبان نہیں بلکہ واقعات و حادثات ہیں، جس میں سچائی، جذبہ کی گہرائی اور گیرائی ہے۔یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے ہر طبقے میں ذوق وشوق سے پسند کیا جائے گا۔یہ آپ بیتی اردو ادب کی اہم خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا: (۱۹۷۶ء) کلیم عاجز

کلیم عاجز کی اولین حیثیت اردو کے مقبول و معروف شاعر کی ہے۔ان کے یہاں اگر چہ موضوعاتی رنگا رنگی نہیں ہے، اور اس لحاظ سے ان کا دائرہ کار محدود ہے۔لیکن اپنے حدود میں وہ ایک کامیاب شاعر ہیں۔انہوں نے جن موضوعات کو برتا ہے انہیں انتہائی کامیابی کے ساتھ ہم کنار کر دیا ہے۔ان کا پہلا مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' جنوری ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا۔جس میں اردو کے عہد ساز نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد، ممتاز شعرا فراق گورکھپوری اور جمیل مظہری کی آرا شامل ہیں۔

کلیم عاجز نے اپنی دو خودنوشت سوانح عمریاں لکھیں۔'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' میں بھی ''ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ'' کے عنوان سے اپنی مختصر اور جامع سوانح لکھی۔اس طرح دیکھا جائے تو ان کی تین خودنوشت سوانح عمریاں آ چکی ہیں۔

''ادا کیونکر کریں گے چند آنسو دل کا افسانہ'' کم و بیش سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔جس کے ابتدائی صفحات میں اس مجموعے کی شان نزول اور طبعی میلان پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد اپنے خاندان کے حالات کو بیان کیا ہے، جو ان کی پیدائش اکتوبر ۱۹۲۶ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بیان پر ختم ہوتا ہے۔یہ آپ بیتی خالص شخصی انداز میں لکھی گئی ہے، اور اس کی زبان صوبہ بہار بالخصوص تیلہاڑہ (جہاں وہ پیدا ہوئے) کی زبان ہے۔اس آپ بیتی میں کلیم عاجز کے درد نے ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔آپ بیتی کے مطالعے سے اس پورے فسادات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ابھر آتا ہے۔اس فساد میں کلیم عاجز نے اپنے پورے خاندان کو کھو دیا اور بقول

ان کے، ان کی شاعری کا بنیادی محرک بھی ہے۔ اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کے نام کیا ہے، اس دلدوز بیان کے ساتھ ''جن کی شہادت کا غم میرا سرمایہ حیات ہے''۔

اس خودنوشت سوانح عمری میں عام سوانح عمریوں بس ایک چیز ہے، وہ یہ کہ کلیم عاجز کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی، ان کے خاندانی سلسلے کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ان کی تربیت کہاں اور کس نہج پر ہوئی اور ان کا بچپن کیسا تھا۔ دوسری چیزوں سے جو چیز ممیّز کرتی ہے وہ تیلہاڑہ کی تباہی کا دلدوز منظر نامہ ہے۔ جس میں ان فسادات سے پہلے کی وہاں کی زندگی اور ہندو مسلم اتحاد کا دلکش منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آزادی کے گیارہ سال بعد جب کلیم عاجز اپنے گاؤں گئے تو وہاں کا منظر ہی بدل چکا تھا اور صرف وہاں ہندو رہ گئے تھے۔ مگر وہ محبت آج بھی ان کے دل میں تھی جو محبت فسادات کے پہلے تھی، ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کرایہ دار پولس چوکی کے کانسٹبل، حولدار اور تھانیدار میرے قریب جمع ہو گئے۔ اور میری حالت سے متحیر کھڑے ہو گئے۔ میں نے جب گھاس سے اٹھ کر یہ بتایا کہ میرا ہی نام کلیم ہے اور وہ میرے ہی کرایہ دار ہیں۔ پھر دس گیارہ سال پہلے کی کہانی انہیں معلوم ہوگئی۔ تھانے کا پورا اسٹاف بڑی محبت اور عقیدت سے پیش آیا اور آناً فاناً پوری بستی میں بجلی کی طرح بات دوڑ گئی کہ گیارہ سال بعد اس گاؤں میں کوئی مسلمان آیا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے نزدیک بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم ہو گیا۔''[۵]

مندرجہ بالا اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب فساد کے بعد گاؤں کے لوگوں میں اتنی محبت اور عقیدت تھی تو فسادات کے پہلے کا عالم کیا ہوگا۔ فساد کے پہلے ہندو مسلم لڑکے ایک ساتھ اٹھتے، بیٹھتے، کھیلتے، کودتے اور ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جو اتحاد کی ایک مثال تھی مگر فسادات نے ساری محبت و عقیدت کو خاک میں ملا دیا۔

کلیم عاجز نے ان فسادات کا نقشہ خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے، جس میں اتحاد، محبت و عقیدت پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور ایک انسان حیوانیت کی تمام حدود کو پار کر جاتا ہے، اور پھر یہ جنون جب ختم ہوتا ہے تو ندامت کا جو طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے، اس کا بیان بھی اس کتاب میں ہے، جس کا ظاہر ہے حاصل کچھ نہیں ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے کے بعد عوامی زندگی سے کلیم عاجز کے

شغف کا اندازہ بھی اس قسم کے بیانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

''جب میں اسکول سے چھٹیوں میں گھر آتا تو فتوحہ اسٹیشن کو جہاں میرے گھر کے اسٹیشن کو جانے والی مارٹن کمپنی کی چھوٹی لائن شروع ہوتی۔ اپنی جنت عرضی کا دروازہ سمجھتا تھا۔ یہیں سے نئی کیفیات، نئی امنگوں اور نئی خوشیوں کی آہٹیں دل میں گونجنی شروع ہوجاتیں۔ فتوحہ اسٹیشن پر موسیٰ میاں کی چھوٹی سی چائے کی دکان میں چھوٹے چھوٹے ٹیبل کے گرد چند چھوٹی چھوٹی کرسیاں لگی رہتیں۔۔۔ موسیٰ میاں کی شستہ اور شایستہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی علاقے میں ضرب المثل تھی۔۔۔ ایک بار ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں ہمارے جوار کے ایک نئے داماد تھے۔ نئی صورت دیکھ کر موسیٰ میاں نے پوچھا، عزیزم آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟ وہ بھی منچلے اور چست گفتگو کرنے والے تھے۔ اپنے خیال میں دولت خانہ کی رعایت سے معنویت پیدا کرنے کی کوشش میں جواب دیا: ''غریب کا دولت خانہ بہار بنک ہے''۔ موسیٰ میاں نے برجستہ کہا ''اچھا وہ جہاں منی رکھی جاتی ہے''۔ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ میں اس وقت تو نہیں سمجھ سکا۔ اس فقرے اور لفظ 'منی' کی دہری معنویت کا اندازہ بعد میں ہوا۔ اس کے بعد جب دبستان لکھنو کی جب خصوصیتیں سامنے آئیں، رعایت لفظی اور ایہام کی صنعتوں سے باخبری ہوئی تو حیرت ہوئی۔''

[6]

مندرجہ بالا اقتباس سے دو باتیں صاف طور پر ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو عوامی زندگی کی طرف کلیم عاجز کا میلان طبع اور ان کی جزئیات نگاری، دوسری ان کا زبردست حافظہ جس میں اس زندگی اور اس کے گردوپیش کی اہم وغیر اہم تمام حالات وواقعات اس طرح محفوظ ہیں گویا کہ وہ کل کا قصہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ اس کتاب میں ایسے اقتباسات بھرے پڑے ہیں جن سے کلیم عاجز کے حیرت انگیز حافظے اور ان کی تہذیبی قدروں سے والہانہ شیفتگی کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

اس کتاب میں کلیم عاجزؔ نے اپنے شعری تجربات پر بھی اظہار خیال کیا ہے، جس میں کئی کارآمد باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''میری شاعری کی دنیا میں الفاظ کے علاوہ کوئی چیز مستعار نہیں۔ میں بیس برس پہلے تک مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب مطالعہ بھی نہیں کرتا، زندگی تجربات وحادثات کا سلسلہ ہوتی ہے۔ میں زندگی پر گہری نگاہ رکھتا ہوں۔''[۷]

اس بیان سے غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ زندگی کے تجربات و حادثات اور واقعات سے مطالعات کا سلسلہ گویا منقطع ہوتا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔

کلیم عاجزؔ نے اس کتاب میں پیروی میرؔ کے تعلق سے اپنے طرز عمل پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور کلاسیکی غزل کی قوت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''میں نے غزل کے قدیم اصطلاحوں کو، ترکیبوں کو، الفاظ کو دیکھا تو ان میں وقت کا ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت ہے، میں ان کو نئی دنیا کے نئے تجربات اور نئی زندگی کے نئے تقاضوں کا بوجھ رکھنا شروع کیا۔ پہلے پہل ان کے قدم ڈگمگائے، کبھی کبھی یہ گر بھی گئے، مگر آہستہ آہستہ ان میں نیا دم خم پیدا ہونے لگا، ان کے چہروں پر نئی تازگی اور نئی شگفتگی آنی شروع ہوئی۔ ان کے جسموں میں نئی لچک اور آنکھوں میں نئی معنویت بیدار ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ میری زندگی سے پورے طور سے ہم آہنگ ہوگئے۔''[۸]

اور اس کے نتیجے میں وہ آواز ابھرتی ہے جس کے بارے کلیم عاجزؔ نے خود کہا ہے ؎

ہمیں یہ دیکھ کر کہتے ہیں آج کل والے
وہ آگئے روش میرؔ کی غزل والے

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی:۔ کلیم عاجزؔ کی دوسری دو خودنوشت سوانح عمریاں ان کی پہلی کتاب ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' کی توسیع ہیں۔ ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' کلیم عاجزؔ کی دوسری خودنوشت ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ جس پر جلی حرفوں میں کلیم عاجزؔ کا یہ شعر درج ہے ؎

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یاران غزل خواں یاد آئے

کلیم عاجز نے اس آپ بیتی کو لکھنے کے اسباب دیباچے میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

''جب 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' شائع ہوئی تو اس کا دیباچہ جو میں نے جلالی میں لکھا تھا اسے کئی بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ نامعلوم سی خلش دل میں رہی۔ اور کچھ نامعلوم سا تقاضا دل میں پیدا ہوا۔ اور ہر طرف سے اصرار ہوا کہ اسے علاحدہ شائع کردو۔ میں اس ارادے سے بیٹھا کہ اس میں کچھ اضافہ کردوں، لیکن ارادہ کیا کر کے بیٹھا تھا اور لکھ کیا اٹھا یہ آپ کے سامنے ہے۔'' [9]

اس آپ بیتی میں کلیم عاجز نے ابتدائی صفحات میں کلکتہ میں گذارے ہوئے دن کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان صفحات میں کئی مشہور اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ جن میں تھیٹر کے اداکار، ڈرامہ نگار اور ڈائرکٹر وغیرہ کا ذکر ہے۔ کلکتہ میں کلیم عاجز کثرت سے ڈرامہ دیکھتے تھے اور اس کی وجہ سے انہیں مار بھی کھانی پڑی، لیکن بعد میں یہ عادت چھوٹ گئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مشہور پہلوانوں، بدمعاشوں کا ذکر کیا ہے۔ اس آپ بیتی کو شخصیت کا نگار خانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں کم وبیش سو ڈیڑھ سو افراد سے زیادہ کا ذکر کیا ہے۔ کسی کے بارے چند سطریں تو کسی کے بارے کچھ زیادہ لکھ دیا ہے، جس سے الجھن بڑھنے لگتی ہے۔ اس کے باوجود کوئی اہم بات لکھنے سے باقی نہیں رہ گئی ہے۔ چند سطروں میں ہی کردار کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ شخصیت نگاری کا ایسا امتزاج شاید ہی کہیں دوسری جگہ نظر آئے۔ ایک جگہ سید فیض حسن عرف فجے کی تصویر یوں پیش کی ہے:

''دیکھا ایک شخص دراز قد، ہلکا سانولا رنگ، چوڑا چکلا سینہ، کھچڑی بال، ننگے سر، تقریباً ساٹھ سال کی عمر، سفید لٹھے کی لنگی، سفید ململ کا کرتہ اس پر سیاہ انگریزی کوٹ، وارنش کا پمپ، ہاتھ میں چھڑی، شاید کمر کے کسی حصے میں پستول اور ایک چھرا، دو ہمراہیوں کے ساتھ ہلکے ہلکے مسکراتے اور نگاہیں جھکائے، باتیں کرتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ اور سڑک پر گویا

سناٹا ہے۔ یہ فجے بدمعاش یعنی سید فیض حسن عرف فجے تھے
اور یہ اس بدمعاشوں کی برادری میں کچھ نیچے درجے کے
تھے۔'' ۱۰

اس آپ بیتی میں ایسے کئی اشخاص کا خاکہ کلیم عاجزؔ نے پیش کیا ہے، جو کسی سماج و معاشرہ کا ایک حصہ ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران وہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جو ہندو مسلم فساد ہوا اس کا ذکر بھی اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اپر جیت
پور روڈ جہاں میرا مکان تھا خالص غیر مسلموں کا محلّہ، دس پانچ
ادھر ادھر بکھرے مکانات مسلمانوں کے ہزاروں مکانوں کے
درمیان تھے۔۔۔ میرے مکان کے چاروں طرف ہندو اور
مارواڑی امیروں کے مکانات تھے۔ اور ایک متصل مکان
میں پیشہ ور رنڈیاں رہتی تھیں۔'' ۱۱

کلیم عاجزؔ کی ان خودنوشت سوانح عمریوں میں بھی ماضی کے ان زخموں کی مہک چھائی ہوئی ہے۔ جو تیلہاڑہ کے فساد کی دین ہے۔ اور اپنی گردوپیش کی زندگی سے وہی شغف اور رشتوں کے تقدس کا وہی احساس اور ان کی پامالی پر کربناک اور اندوہ کیفیت صاف صاف محسوس ہوتی ہے۔

تقسیم کے بعد کا ہندوستان ان زخموں سے لہلہاتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس میں اس سرزمیں پر جو رام اور سیتا اور گوتم بدھ کی سرزمین کہلاتی ہے۔ انسانی رشتوں کی پامالی اور تہذیبی اقدار کی پامالی کے عجیب وغریب نمونے اس آپ بیتی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہیں دیکھنے والی آنکھیں سیکڑوں اور کروڑوں ہوں گی، جنہوں نے ان مناظر کو دیکھا۔ کچھ قطرے خون کے ٹپکائے اور پھر کاروباری زندگی میں مصروف ہوگئے۔ مگر کلیم عاجزؔ کی آنکھیں ایسی ہیں جو ان واقعات کو اب بھی چلتا پھرتا دیکھتی ہیں، اور ان پر خون کے قطرے ٹپکا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسے حساس فن کار کی آنکھیں ہیں جو ان کربناک مناظر کو بھول نہیں سکتی ہیں۔ اس لئے ان فسادات کا بیان کلیم عاجزؔ کی خودنوشت سوانح عمریوں میں مرکزی حوالہ کی حیثیت اختیار کر گیا، اور اس کے بیان میں کلیم عاجزؔ کی شخصیت کا گداز اس طرح شامل ہوگیا ہے کہ ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' میں اگرچہ کلیم عاجزؔ اپنے قیام کلکتہ کی روداد لکھی ہے۔ لیکن اس

کے علاوہ بھی وہ حالات وواقعات بیان کئے ہیں جو اس وقت ہندوستان میں تھے اور خاص کر کلکتہ اور بہار کے حالات وواقعات کو اس آپ بیتی میں زیادہ جگہ دی ہے۔ چونکہ بہار اور خاص کر تیلہاڑہ اور کلکتہ سے ان کی یادیں جڑی ہیں اس لئے ان دونوں جگہوں کا ذکر اس آپ بیتی میں زیادہ ہے، اور اس میں بھی خاص کر فساد کا ذکر ۱۹۴۷ء کے فساد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''پٹنہ اس وقت چھوٹا سا میدان حشر تھا۔ ہر طرف زنجیروں کی جھنکار تھی، ہر طرف سے ان کی زلفوں کے گرفتار آرہے تھے۔ میدان حشر تو وہی ہے جو ایک دن برپا ہونے والا ہے۔ لیکن دنیا نے

''دیکھی ہے تری چال سے سو بار قیامت''

میں نے بھی ایک چھوٹا سا میدان حشر دیکھا تھا۔ فرق یہ تھا کہ حشر میں سب کا لباس یکساں ہوگا یا ہر شخص بے لباس ہوگا۔ کسی کو یہ ہوش نہیں ہوگا کہ اپنے ماسوا کسی اور کو دیکھے۔ وہاں کوئی امیر نہ ہوگا کوئی غریب نہ ہوگا۔ ایک آہنگ ہوگا ایک رنگ ہوگا۔ ایک آواز ہوگی اور ایک پکار ہوگی۔۔۔ نفسی نفسی نفسی۔۔۔ کس کا سر آنچل سے محروم ہے، کس کی کلائیاں چوڑیوں سے خالی ہے، کس کے سر پر کتنے زخم ہیں، کس کے سینے پر کتنے گھاؤ ہیں۔۔۔ کون یتیم ہے، کون بیوہ ہے، کون بے کس ہے، کس کی کوکھ برباد ہوئی، کس کی مانگ اجڑ گئی، کس کا سہاگ لٹ گیا، کس کی آس ٹوٹ گئی، کس کی قسمت پھوٹ گئی۔۔۔ اس میدان حشر میں یہ سب کچھ نہ ہوگا۔ یہاں یہ سب کچھ تھا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔۔۔''[۲۱]

آگے لکھتے ہیں:

''شام ہوئی، رات ہوئی، میری گلی میں پچاسوں مکانات تھے۔ میں ایک میں کرایہ دار تھا بقیہ تمام مکانات ہندو کے تھے اور ہیں۔۔۔ کچھ نعروں کی آوازیں آئیں اور مستقل آتی رہیں۔ 'بجرنگ بلی کی جے'۔۔۔ 'اللہ اکبر'۔۔۔ میری گلی میں

لوگوں کے اچھلنے کودنے اور نعریں لگانے کی آوازیں آنے
لگیں۔ ساتھ ساتھ تلواروں کی چھن چھناہٹ اور لاٹھیوں کی
کھڑکھڑاہٹ بھی۔۔۔گلی میں لوگ تلواریں، لاٹھیاں اور
بھالے لے کر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔''[۱۳]

غرض یہ کہ فسادات کی کیفیت اس خودنوشت سوانح عمری میں چھائی ہوئی ہے۔اس میں جہاں ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی انتہاپسندی، حیوانیت اور بربریت کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد، ان کی دردمندی اور چارہ سازی کے بھی کئی نقشے دکھائی دیتے ہیں۔ایسا ہی ایک کردار شہر کے 'ایس پی ورما صاحب' کا ہے۔ جب فساد ہر طرف پھیل گیا تو کلیم عاجز اپنے افراد خانہ کے خبر لینے کے لئے تیلہاڑہ جانے کو نکلتے ہیں۔مگر راستے تمام بند، کچھ ہی دور پہونچ پاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ بغیر پولیس کی مدد کے یہاں سے آگے نہیں جایا جاسکتا اور جنون کی کیفیت میں سیٹی ایس پی ورما صاحب کے مکان پر جاتے ہیں ایسے عالم میں ورما صاحب ان کی مدد کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ گھر پہونچ پاتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی کئی ایسے کردار ہیں جو مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس خونی واقعے کی تمام جزئیات کلیم عاجز کے حافظے میں محفوظ ہیں۔اور وہ ان کی زندگی کا بنیادی حصہ ہیں۔ذکر کوئی بھی ہو، روداد کہیں کی بھی ہو کلیم عاجز کا ذہن اس واقعے اور اس کے کرب سے کنارا نہیں کرسکتا۔اور اس کے بیان کے لئے جو زبان انہوں نے اختیار کی ہے وہ زبردست تاثیر رکھتی ہے اور اس میں ان تمام واقعات وحادثات کے من وعن بیان کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔اس لحاظ سے کلیم عاجز کی یہ سوانح عمریاں برصغیر کے فسادات کی ایک زندہ اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں۔جس میں ایک طرف جہاں ایک طرف مذہب کا جنون اپنی انتہا پر نظر آتا ہے تو وہیں دوسری طرف ہندوؤں ومسلمانوں دونوں کے درمیان دردمندی، انسان دوستی اور ایک دوسرے سے شیفتگی کے بھی کمیاب مگر دلپذیر مرقعے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' صرف ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی متحرک تصویر معلوم ہوتی ہے جس میں اس عہد اور اس عہد میں سانس لینے والے انسانوں کے نشیب وفراز کو صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ابھی سن لو مجھ سے:۔ کلیم عاجز کی تیسری خودنوشت سوانح حیات ہے، جو ۱۹۹۲ء میں

شائع ہوئی۔اس کتاب کا نام ان کے ایک شعر سے مستعار ہے۔جلی حرفوں میں یہ شعر کتاب کے اوپر لکھا ہوا ہے۔

یہ بیان حال گفتگو، ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو نہ سنو گے ایسی کہانیاں

اور اس آپ بیتی کے پیش لفظ میں 'ایک پکار ہے' کے ایک شعر ہے۔'ایک دعوی ہے' کے تحت ایک اور 'ایک دعوت ہے' کہ تحت ایک شعر درج کیا گیا ہے۔اس کتاب کا پہلا جملہ ہی محل نظر ہے۔جو درج ذیل ہے۔''ابھی سن لو مجھ سے'' کا مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ لکھنے بیٹھا ہوں'' [۱۳]

اس جملے میں مقدمہ، دیباچہ اور پیش لفظ میں امتیاز نہیں کیا گیا ہے اور انہیں ایک ہی قبیل کی چیز سمجھا گیا ہے جو کلیم عاجز جیسے شاعر اور نثر نگار کو زیب نہیں دیتی۔ یہ پیش لفظ سترہ (۱۷) صفحات کو محیط ہے۔جس میں کلیم عاجز کی گداز طبیعت اور ماضی کے واقعات سے گہری وابستگی اور فسادات کے خونی زخم چھائے ہوئے ہیں۔اس میں کلیم عاجز نے اپنے ادبی موقف کا اظہار تقریباً نہیں کے برابر کیا ہے۔ ماضی کے ہندو مسلم فسادات میں کلیم عاجز کے جو عزیز شکار ہوئے ان کی نہایت موثر تصویر اس پیش لفظ میں ملتی ہے، اور کسی قدر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا تصور ہندوستان میں پارہ پارہ ہو کر بکھر چکا ہے۔اس کتاب میں ۱۹۶۴ء کے جمشید پور کے فساد میں جو پہلا شخص شہید ہوا اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔وہ لڑکا کلیم عاجز کے رشتے کی ایک بھتیجی کا شوہر تھا۔اس کے علاوہ ان کے بھائی علیم احمد کی جواں مرگی کا تذکرہ ہے۔ان واقعات سے کلیم عاجز کی شخصیت نے جو اثر قبول کیا ہے اس کا بھی بیان ہے۔لکھتے ہیں:

> ''تو خیر یہ دیباچہ ایک نالۂ درد ہے ایک آہ سرد ہے ایک صدائے اضطراب ہے۔انسان کی ذہنی اور فکری بیماری کے مشاہدہ کے بعد خطرے کا ایک اعلان ہے، جو یہ بیماری انسان کو ہر طرف سے نرغے میں لے رہی ہے۔ایک تنبیہ ہے اس انجام کی جو اسے دبوچنے والا ہے۔تمام عالم اس خطرے میں مبتلا ہو چکا ہے اور عالم اسلام اس خطرے سے قریب ہو چکا ہے اور ہمارا ملک تو اس خطرے میں پڑ چکا ہے۔ہمیں اپنا غم ہے اور اپنے ملک کا غم بھی ہے۔ہم نے اس ملک کو سنوارا ہے، اسے چار چاند لگائے ہیں، اسے سجایا ہے بنایا ہے، ہم نے خود کو

کھوکر اسے پایا ہے۔اب یہ بھی کھو جانے والا ہے۔'' ۱۴

اس کتاب کے پیش لفظ میں کلیم عاجز نے اپنے ادبی مسلک پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو اگر چہ بے حد مختصر ہے، لیکن نہایت زہرناک ہے۔ لکھتے ہیں:

'' شاعر، ادیب، فن کار کی پہچان بہت سہل اور بہت دشوار ہے۔جس نے بات پہچان لی، بات والے کو پہچان لیا۔جس نے کلام کو پہچانا، متکلم کو پہچان لیا۔اب تو نہ کوئی بات پہچانتا ہے، نہ کلام۔اس لئے کہ باتوں کی انتہا نہیں، نظم میں نثر میں نئے نئے پیرائے میں، نئی نئی ہیئت میں، اب لوگ پیرایہ ہیئت ہی چاہتے ہیں۔کوئی نئی چیز چاہئے۔اس نئی چیز سے جتنا لوگوں کو چاہئے بیوقوف بنا لیجئے۔رباعی نہیں، بیت نہیں، رباعی نہیں دوہا نہیں تو اب ''ہائکو'' لائے۔نام بھی ایسا کہ لوگ چونک پڑیں۔۔۔اب جناب ''ہائکو'' ہے۔۔۔تو لیجئے جناب یہ آزاد غزل ہے، لیجئے جناب ''یہ مختصر افسانہ'' ہے، تو جناب یہ طویل ''مختصر افسانہ ہے''۔'' ۱۵

لطف زبان سے قطع نظر یہاں کام کی باتیں ہیں تو اتنی کہ کلیم عاجز کو نئے نئے تجربات سے زیادہ دلچسپی نہیں اور وہ پرانی ہیئتوں میں اظہار خیال کو زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں۔لیکن اس سے نئے تجربات کی اہمیت کم نہیں ہوتی اور ان پر کلیم عاجز کی چھینٹا کشی سے کوئی شخص اچھا تاثر قبول نہیں کر سکتا۔ہائیکو اور آزاد غزل اب بطور صنف قائم ہو چکی ہیں اور ان پر کلیم عاجز کا آواز کسنا ان اصناف کو نہیں بلکہ کلیم عاجز کو نقصان پہونچاتا ہے۔

یہ خودنوشت سوانح حیات ۵۵-۱۹۵۶ء سے شروع ہوتی ہے۔جس میں اس زمانے کے پٹنہ کا تہذیبی پس منظر کافی تفصیل سے سامنے آتا ہے۔اس میں پٹنہ کا ادبی ماحول کلیم عاجز کی شخصی اور غیر شخصی آشنائیاں اور اس عہد کا سیاسی وسماجی مدوجزر صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہ عہد سیاسی طور پر کافی اتھل پتھل کا زمانہ رہا ہے۔خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ زمانہ کئی لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ایک تو ہندوؤں و مسلمانوں کا مشترکہ غم جو اس خواب کے بکھرنے سے اٹھا تھا۔جو آزادی کے بارے میں ہندوؤں و مسلمانوں نے دیکھا تھا۔لیکن جب آزادی ملی تو اس میں ان خوابوں جیسی رعنائی و دلکشی ناپید تھی، اور آلام و مصائب کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ہندوستان کی آزادی اپنے جلو میں

لائی تھی۔ دوسرا مسلمانوں کا تہذیبی طور پر بکھر جانے کا غم جو برصغیر کی تقسیم کا لازمی نتیجہ تھا، اور پٹنہ ان دونوں کا مرکز تھا، جس کا اندازہ اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''۱۹۳۸ء میں جب میں اسکول کی آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سبزی باغ کے کمرے میں کچھ دنوں کے لیے مقیم تھا ۔۔۔ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہو رہا تھا۔ مسٹر عبدالعزیز مرحوم بیرسٹر اور ان کے مخلص ساتھیوں کے اخلاص اور محنت برگ وثمر لا رہی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلم زعما اور مسلم عمائدینِ ملک کے ساتھ پٹنہ میں مقیم تھے۔ میں کسی سیاسی تحریک سے کبھی دلچسپی نہیں رکھتا تھا ،اور ذہنی اور فکری طور پر اس قابل بھی نہ تھا۔ مگر مجھ سے بہت چھوٹے چھوٹے طالب علم اور عوام کے بچے مسلم لیگ کی گرمی سے مجسم شعلہ عریاں بنے ہوئے تھے۔ جھنڈیوں اور نعروں سے شہر سج رہا تھا اور گونج رہا تھا۔۔۔ پٹنہ ایسا گرم تھا جیسے وہی پاکستان کا مرکز تھا۔''[۱۶]

مندرجہ بالا اقتباس سے پٹنہ کی سیاسی سرگرمی اور مرکزیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کلیم عاجز سیاسی معاملات سے یکسر منقطع ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''عمر کے پچپن (۵۵) سال گذر گئے جس میں ۴۲ سال تو صرف پٹنہ میں گذرے مگر میں کسی نوعیت کی کسی پارٹی کی کسی تحریک میں کے سیاسی جلسے میں آج تک شریک نہیں ہوا۔ بجز ایک جلسے کے جسے آگے بیان کروں گا'' [۱۷]

اگرچہ کلیم عاجز کا براہ راست کسی پارٹی یا سیاسی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہ تھا، تاہم بالواسطہ طور پر وہ اس عہد کی سیاست کے تمام رموز سے آگاہ تھے جس کا اظہار گاہے بگاہے اس آپ بیتی میں ہوا ہے۔

''ابھی سن لو مجھ سے'' میں کلیم عاجز کی دوسری خودنوشتوں کی طرح فسادات کا ذکر بہت ملتا ہے اور اس کے نتیجے میں کلیم عاجز کی زندگی جن حالات سے دوچار ہوئی ان پر بھی روشنی ڈالی گئی

ہے،اس فرق کے ساتھ کہ ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' میں کس قدر ضبط غم کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جب کہ ''ابھی سن لو مجھ سے'' میں 'مضمحل ہو گئے قویٰ غالب'' کی سی کیفیت ملتی ہے۔اوران فسادات کے ذکر پر گویا ہچکی سی بندھ جانے کا منظر سامنے آجاتا ہے۔

اس خودنوشت سوانح عمری میں بیشتر پٹنہ کی زندگی کا ذکر ملتا ہے، جو شاید اس لیے بھی ہے کہ یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد کلیم عاجز نے پٹنہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔اور یوں بھی سفر سے ان کی طبیعت کو بیر ہے،اس لیے ان کی زندگی ایک معمول کی پابند عام طور پر رہی ہے۔کہیں کہیں ان سفروں کا بیان جو کلیم عاجز نے مشاعروں کے تعلق سے کیا ہے،لیکن ان میں اختصار سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقی سفر کا کوئی ارتقائی مطالعہ پیش نہیں کیا ہے۔اور اسے ایک طرح سے وہبی تصور کر کے اس پر اظہار خیال سے گریز کیا ہے، جو دور جدید کے ایک شاعر کی حیثیت سے کلیم عاجز کے منصب کے خلاف ہے۔اسی طرح آخری حصے میں اپنے بزرگ معاصر کی آرا کو بھی شامل کیا ہے جو کلیم عاجز کی شاعری کے تعلق سے محفوظ ہیں،اور پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔لہذا ان کی یہ ادا طبع سلیم پر بار گذرتی ہے۔

اس آپ بیتی میں اردو تحریک اور خاص کر بہار کی اردو تحریک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے،لیکن یہ بیان سرسری قسم کا ہے۔کلیم عاجز فطرتاً تنک مزاج واقع ہوئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔''چھوٹے چھوٹے تہذیبی وسماجی تعلقاتی غم بھی میری زندگی کو بدمزہ کر دیتے ہیں'' ۱۸

اس کتاب میں کلیم عاجز نے کئی جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ احساس کمتری کا شکار کبھی نہیں ہوئے لیکن اگر اس کتاب کا تجزیہ کیا جائے تو واقعات و حالات اس کے برعکس گواہی دیتے ہیں۔انہوں نے جس طرح میر کا ان کے والد کے ساتھ معاملے کو پیش کیا ہے یا جس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار سے اپنی معمولی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔اس سے احساس ہوتا ہے کہ کلیم عاجز شدید طور پر احساس کمتری کا شکار رہے ہیں، جو شاید دنیا کی دوڑ میں اپنے معاصرین سے پیچھے رہ جانے کے احساس کا زائیدہ ہے۔وہ اپنی شخصیت کو ہر جگہ عام سطح سے کچھ بلند کرتے ہیں اور اپنے آپ کو لیے دیے رہنے میں یقین رکھتے ہیں۔اسی طرح اس آپ بیتی میں میں جگہ جگہ اپنے اشعار کو پیش کرنا جو شاعرانہ تعلّی سے بھرے ہیں، بھی ان کے احساس کمتری کا شکار ہونے کا اشارہ کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیم عاجز کی تمام خودنوشت سوانح عمریاں ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' اور ''ابھی سن لو مجھ سے'' کامیاب خودنوشت سوانح عمریاں

ہیں۔جس میں تیلہاڑہ،کلکتہ، پٹنہ اور گردوپیش کی نصف صدی محفوظ ہوگئی ہے۔یہ اپنی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کے باوجود اردو ادب میں ایک کامیاب آپ بیتی کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔لیکن بطور صنف کلیم عاجز کی دوسری خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' ''ابھی سن لو مجھ سے'' سے زیادہ کامیاب ہے۔جس کا سبب غالباً یہ بھی ہے کہ زمانے کی ناقدری اور شخصی پسپائیوں سے کلیم عاجز کی شخصیت نے جو اثر قبول کیا ان کے مضر اثرات ''ابھی سن لو مجھ سے'' پر زیادہ مرتسم ہوئے ہیں۔اس لئے کہ عمر کی اس منزل میں ضبط غم کا یارا اس قدر نہیں رہتا جو مثلاً ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' کے لکھتے وقت کلیم عاجز میں رہا ہوگا۔اور کلیم عاجز کو اپنی اہمیت اور برتری کا اتنا شدید احساس بھی غالباً اس زمانے میں نہیں رہا ہوگا۔جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو کلیم عاجز نہایت شستہ ورفتہ زبان لکھتے ہیں جو سوانحی واقعات کے لیے موزوں ہے۔اور اس کی روانی، برجستگی اور سماں بندی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اگرچہ فسادات کے بے جا ذکر سے طبیعت کسی قدر مکدر بھی ہوتی ہے۔لیکن ان چھوٹی چھوٹی خامیوں کے باوجود یہ آپ بیتیاں اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بمبئی کی بزم آرائیاں: (۱۹۸۸ء) رفعت سروش

''بمبئی کی بزم آرائیاں'' ترقی پسند شاعر رفعت سروش کی پہلی خودنوشت سوانح حیات ہے۔جس میں انہوں نے ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک اپنے بمبئی کے تیرہ سالہ تلخ وشیریں یادوں کا احاطہ کیا ہے۔اس خودنوشت کا ۱۹۵۸ء میں راجدھانی دہلی میں تبادلے کی وجہ سے اختتام ہوتا ہے۔اس میں انہوں نے اپنے بمبئی میں پہونچنے اور نوکری کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھاننے سے لے کر بہت سارے دوستوں اور رفیقوں کا تذکرہ مختلف واقعات کے درمیان کا ہے۔جس طرح اس وقت لکھنؤ، دہلی، لاہور، عظیم آباد، حیدرآباد اور دکن وغیرہ اردو زبان وادب کا ایک گہوارہ تسلیم کیا جاتا تھا اسی طرح بمبئی بھی اردو زبان وادب کا گہوارہ تسلیم کیا جاتا تھا، جہاں پر سجاد ظہیر، کنور محمد اشرف، پریم دھون، کرشن چندر، سبط رضی، سردار جعفری، حبیب تنویر، ذوالفقار بخاری، ظ۔انصاری، اختر الایمان، اعجاز صدیقی، باقر مہدی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی وغیرہ موجود تھے۔

رفعت سروش کی پیدائش ۲ جنوری ۱۹۲۶ء میں نگینہ ضلع بجنور میں ہوئی۔نگینہ اور موانہ (ضلع میرٹھ) میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سترہ (۱۷) سال کی عمر میں دہلی کی سرزمین پر قدم رکھا۔دہلی میں کئی جگہ ملازمت کرنے کے بعد ۴ جون ۱۹۴۵ء کو پنجاب میل سے بمبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔چونکہ پربھات فلم کمپنی کے ہدایت کار اور نامور افسانہ نگار شاہد لطیف کی ایما پر گانے لکھنے کی

غرض سے بمبئی آئے تھے۔لیکن شاہد لطیف کے انکار نے انہیں دل برداشتہ کر دیا، مگر وہ مایوس نہیں ہوئے اور تلاش معاش کا سلسلہ جاری رکھا، اسی دوران ذوالفقار بخاری نے کل ہند ریڈیو میں ملازم رکھ لیا، اور ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء میں پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۸۴ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ہی اس عہدے سے رخصت ہوئے۔

رفعت سروش اپنی زندگی کے اس دور کے حالات وواقعات کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میرے لئے چیلنج تھی۔میں ملازمت سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کی بلڈنگ تک نہ دیکھی تھی، اسٹوڈیو تو دور کی بات ہے۔'' ۱۹

بمبئی بچپن سے ہی رفعت سروش کے خوابوں کا شہر تھا۔لکھتے ہیں:

> ''بمبئی میرے خوابوں میں بسا ہوا تھا۔چار پانچ سال کے عمر سے ہی میں جس شخص کی شان وشوکت اور ٹھاٹ دار لباس سے مرعوب ہوا تھا وہ تھے بھائی امتیاز۔۔۔وہ میری یاد سے پہلے ہی بمبئی چلے گئے تھے، مگر ان کا پہلی بار بمبئی سے لوٹنا مجھے یاد ہے۔ڈھیر سارے کپڑے، شیروانیاں، شلواریں اور طرح طرح کے سامان۔ان کی آمد سے ہمارے نگینہ کے چھپر کے چھوٹے سے گھر میں جیسے بمبئی کے محل اتر آئے تھے اور تبھی سے میں بمبئی کا خواب دیکھنے لگا۔'' ۲۰

رفعت سروش کے بمبئی جانے کا مقصد سیر وسیاحت نہیں بلکہ فلمی دنیا سے رابطہ قائم کر کے کسب معاش کی خاطر فلمی گانے لکھنے کا شوق تھا، ان کی دلی آرزو تھی کہ وہ فلموں میں گانے لکھیں۔ایک جگہ اپنی آمد کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''میرا بمبئی جانے کا مقصد سیر وسیاحت نہیں بلکہ کسب معاش تھا۔یوں تو ۱۹۴۳ء میں دہلی کے مختلف دفتروں میں کام کر چکا تھا اور یہاں نوکری کی کمی نہ تھی مگر جو چیز مجھے کھینچ کر بمبئی لے گئی وہ فلموں میں گانے لکھنے کی آرزو تھی۔'' ۲۱

قیام بمبئی کی تقریباً ساری مدت رفعت سروش نے ایک چھوٹے سے کمرے میں

گذاری، جسے بمبئی والے 'کھولی' کہتے ہیں۔اس کمرے میں آٹھ آدمی کا بیڈ، ڈرائنگ روم، غسل خانہ اور باورچی خانہ تھا۔اکثر مہمان بھی اسی کمرے میں آکر رہتے تھے۔رفعت سروش نے اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کمرے میں گذارے۔اس خودنوشت میں رفعت سروش نے اپنی داستان زندگی کو درمیان سے شروع کیا ہے۔یعنی ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کے حالات وواقعات اور تجربات ومشاہدات کو اس آپ بیتی میں پیش کیا ہے، جو ان پر بمبئی کے دوران گذری۔

''بمبئی کی بزم آرائیاں'' یادوں کا ایک رنگ محل ہے، جو صرف تیرہ (۱۳) سال پر محیط ہے۔ اس میں سینکڑوں کردار ایک ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔رفعت سروش اس میں اپنی ذات کو بے نقاب کرنے کے بجائے خود کو زیادہ پس منظر میں رکھتے ہیں۔سردار جعفری کے علاوہ تمام دوستوں، رفیقوں، آشناؤں اور ساتھیوں کا ذکر رفعت سروش تحسین آمیز انداز میں کرتے ہیں۔اور جہاں تک اس زمانے کی ریڈیو اسٹیشن کی زندگی کا تعلق ہے، تو یہ آپ بیتی ایک دستاویز کا حکم رکھتی ہے۔ترقی پسند تحریک ۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کن کن مرحلوں اور راستوں سے ہو کر گذری ہے، اس کا ایک خوبصورت بیان اس آپ بیتی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔اس آپ بیتی کے ذریعے مصنف کے فکر ونظر کا ایک اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے۔تنقیدی شعور کی جھلکیاں اس میں جا بجا نظر آتی ہیں۔رفعت سروش، جاں نثار اختر کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''جاں نثار اختر بھی ''مقصدیت زدہ'' ادب کا شکار ہوئے اور بہت دن تک ایسی سپاٹ نظمیں کہتے رہے جو ان کے اپنے رنگ وآہنگ سے مطابقت نہ رکھتی تھیں اور جن پر وہ ''راہ راست'' پر آنے کے بعد شرماتے ضرور ہوں گے۔کیونکہ صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار اختر کی شاعری کا نیا جنم ہوا اور ان کی دل میں اتر جانے والی نظمیں اور غزلیں ''خاک دل'' اور ''پچھلا پہر'' میں شائع ہوئیں۔جن کے ذریعے جاں نثار اختر نے اپنی بازیافت کی۔ورنہ پہلے مجموعہ کلام ''سلاسل'' کے بعد ان کا مجموعہ ''جاوداں'' بہت کمزور اور وقتی قسم کی نظموں پر مشتمل ہے۔'' ۲۲

سردار جعفری کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سردار جعفری کی جس کتاب نے ایک گروہ (ترقی پسند) کے
ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو
سلام'' ہے۔ جس میں سردار نے روایتی شاعری کی ڈگر سے
ہٹ کر آزاد نظم کی تکنیک کو برتا ہے۔ اگر چہ ''نئی دنیا کو سلام''
کی آزاد شاعری میں راشد کی شاعری جیسا سحر انگیز آہنگ اور
تہہ داری نہیں ہے مگر ایک شکوہ ہے اور مکالماتی قوت ہے جو
سردار جعفری کے شعری آہنگ کو ممیّز کرتی ہے۔''۲۳

سردار جعفری کی شاعری کے اس جائزے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا ذکر اس آپ بیتی میں کئی جگہوں پر آیا ہے۔ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رفعت سروش کے اندر تنقیدی صلاحیت بھی موجود تھی۔

''بمبئی کی بزم آرائیاں'' میں ایک بڑا حصہ آل انڈیا ریڈیو کی بہار و خزاں سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال کی داستان پر مشتمل ہے۔ اس خودنوشت میں ترقی پسند تحریک سے متعلق مواد تو کافی ملتا ہے، اس کے ساتھ ہی اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں کی چشمکوں کی بدولت ''جدیدیت'' کے رجحان کی نئی تحریک، اور فروغ کے سلسلے میں بھی کافی معلومات ملتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''۱۹۶۰ء کے آس پاس ''جدیدیت کے رجحان کی کونپلیں پھوٹیں مگر اس کی تخم ریزی ہمیں لوگوں نے کی تھی۔''۲۴

''بمبئی کی بزم آرائیاں'' صرف ریڈیو کی ملازمت یا ترقی پسند مصنفین کی داستان نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسے شاعر و ادیب کی داستان حیات ہے جسے بمبئی جیسے شہر میں سر چھپانے اور ٹھکانہ ڈھونڈنے کے علاوہ تلاش معاش کے سلسلے میں مسلسل جدوجہد کرنی پڑیں، جہاں پر اس کا سابقہ عجیب وغریب کرداروں سے ہوتا ہے۔ ''زینب چیمبرس'' میں اس کا قیام ہوتا ہے جہاں پر بے شمار معروف وغیر معروف مقامات ہیں اور کئی لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی جگہ پر اس نے بہت سے خوبصورت اور مشہور و معروف نظمیں اور منظوم ڈرامے لکھے۔

رفعت سروش کے اندر سچ بولنے، سننے اور برداشت کرنے کی قوت بہت ہے، جس کی مثالیں اس آپ بیتی کے مطالعے کے دوران ملتی ہیں۔ وہ اپنے متعلق جس بے باکی، بے تکلفی اور بے مروتی سے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں، دوسروں کے متعلق بھی اتنا ہی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ انہیں یہ کہنے میں کوئی برائی یا عیب نظر نہیں آتی کہ سر چھپانے کے لیے ایک چھت کی طلب نے انہیں

اس وقت کے وزیر داخلہ ''مرار جی ڈیسائی'' کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا ڈرامہ لکھنے پر مجبور کر دیا جو ان کے اپنے نظریات کی نفی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی معصومیت سے یہ سنا دیا کہ دس پندرہ روپئے کی خاطر ایک مالدار لیکن ناخواندہ بزرگ کو غزلیں فراہم کرتے رہے۔ انہوں نے اس آپ بیتی کے اندر بڑی خوبصورتی کے ساتھ تلخ حقائق کا ذکر کیا ہے، جو اس آپ بیتی کے علاوہ دوسری جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔

''بمبئی کی بزم آرائیاں'' ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری ہے جس میں آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی موجود ہے۔ اس میں کردار نگاری کے علاوہ منظر نگاری کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں مصنف نے مطالعے کے ذریعے اپنے تجربات ومشاہدات کو پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ اشعار بھی ملتے ہیں جو انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ رفعت سروش ان لوگوں میں سے ہیں جو تھوڑا سا چھپا کر زیادہ بے حجاب کرتے ہیں۔

رفعت سروش ایک تخلیقی ذہن رکھتے ہیں انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران اردو مجلس میں طرحی مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا اور اردو مجلس کو صحیح معنوں میں اردو کی مجلس بنا دیا۔ بمبئی کی آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے آخری سالوں میں رفعت سروش کا زیادہ تر وقت وودھ بھارتی کے پروگرام سنوارنے میں گذرا۔ صبح سے شام تک ان کا سارا وقت اپنے فرائض انجام دینے میں گذرا۔ اگست ۱۹۵۸ء میں ان کا اچانک تبادلہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر کر دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے تک ریڈیو سے جڑے رہے۔ ان کی نثر بہت ہی سادہ، شگفتہ اور رواں دواں ہے۔

اور بستی نہیں یہ دلی ہے:۔ رفعت سروش کی خودنوشت سوانح حیات ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' کی دوسری کڑی ہے۔ یہ کتاب رفعت سروش کی ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک تقریباً تیتیس (۳۳) سال کی داستان حیات ہے۔ جسے انہوں نے دلی میں گذارا۔ ۱۹۵۸ء میں بمبئی سے دلی آئے تو پھر مستقل طور پر یہیں پر بس گئے، اور یہیں پر اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' رفعت سروش کی ایک ایسی دلچسپ اور مفید خودنوشت ہے جو ان کی دہلی میں گذری ہوئی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ اس آپ بیتی میں مختلف حالات وواقعات، حادثات، اداروں، انجمنوں کی مصروفیات اور مشاغل کا ذکر ملتا ہے۔ ''حرف آغاز'' میں مصنف نے اس کتاب کا مختصر تعارف اس طرح کرایا ہے:

''میں نے ان صفحات میں یہی کوشش کی ہے کہ اپنی زندگی کے اس طویل عرصے کی روح کو الفاظ کا روپ دے دوں، اپنے احساسات کو لفظوں میں ڈھال دوں۔ اپنی زندگی اور اپنے ماحول، اپنے حبیبوں، اپنے حلیفوں اور حریفوں کے چہرے اجال کر دوں اور اپنے دور کو قلم بند کر دوں۔۔۔۔ میں لکھتا چلا گیا۔۔۔۔ لکھتا چلا گیا۔۔۔۔ اور اب جائزہ لیتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کا ایک طوفان ہے جو موجزن ہے، چہروں کی ایک کہکشاں ہے جو کبھی دھندلے، کبھی روشن ماحول میں میرے اردگرد جھلملا رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب میری شخصیت کے ہی حصے ہیں اور ان کے بغیر میری زندگی کی تصویر بننی ممکن ہی نہ تھی۔ میں اس محفل میں خوش بھی ہوا ہوں اور جھنجھلایا بھی، آبدیدہ بھی ہوا ہوں اور قہقہے بھی لگائے ہیں۔۔۔۔'' ۲۵

پوری کتاب اس تعارف میں سمٹ کر آ گئی ہے، اور جب یہی تعارف تیس (۳۰) ابواب میں پھیلتا ہے تو ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' کی شکل میں قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔

اس خودنوشت میں دہلی اور اس کے محلے، وہاں کے بسنے والے عام آدمی کے علاوہ بے شمار افراد کا ذکر ملتا ہے۔ جس میں شعرا اور نثر نگار، ریڈیو آرٹسٹ، موسیقار، دفتر کے ساتھی، شریک حیات، دوست اور دشمن کے ساتھ ساتھ ایسے اشخاص کا بھی ذکر ملتا ہے جو کچھ بھی نہیں تھے پھر بھی اس کتاب میں وہ جگہ پا گئے ہیں۔ ان لوگوں سے متعلق مصنف نے ایسی ایسی باتیں کتاب میں محفوظ کر دی ہیں جو عام طور سے لوگوں کے علم میں نہیں تھیں۔ ایسے لوگ بھی اس کتاب میں دیکھنے کو ملتے ہیں جو مصنف کی زندگی کی سفر میں دور تک ساتھ چلے، کچھ لوگوں نے تھوڑی دور تک ساتھ دیا اور کچھ نے شعوری یا لاشعوری طور پر رہنمائی کی اور غائب ہو گئے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے نہ صرف ان کے مزاج اور انداز فکر کا پتہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ ان کی نثری تحریر کی پختگی اور شائستگی کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

''اس شہر کا مخصوص کردار ہے آدمی اپنے کام اور علم و فضل سے نہیں اپنی کرسی اور عہدے سے پہچانا جاتا ہے۔'' ۲۶

آگے لکھتے ہیں:

''اور میں سوچتا ہوں کہ مقبول اور مشہور ہونا بھی کیسی کیسی مشکلات پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات تو میں نے ایسے بہت سے موقعوں پر سوچی کہ دوسرے ممالک میں ریڈیو اور ٹی۔وی کی شخصیات کو بنایا جاتا ہے ان کی شہرت سے خود محکمہ کی عزت بڑھتی ہے اور ہمارے یہاں ہر اس شخص پر خاک اچھالی جاتی ہے جس کی شہرت کا ستارہ چمکنے لگے۔'' ۲۷

''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' سادگی اور سچائی کا مظہر ہے، تحریر میں شگفتگی، روانی اور کیفیت ہے۔اس کے علاوہ جگہ جگہ شعر اور مصرعے کا برمحل استعمال اس خودنوشت سوانح حیات کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔

اس آپ بیتی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفعت سروش ایک ذہین اور باصلاحیت انسان کا نام ہے، جس کی یادداشت بہت ہی اچھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دلی کی طویل دور تقریباً بتیس (۳۲) سال کے واقعات و حالات اور حادثات کے اظہار، اور مختلف اشخاص کو ان کی خصوصیات کے پیکر میں پیش کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' میں یوں تو بہت کچھ ہے مگر ریڈیو اور اردو مجلس کا ذکر ضرورت سے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔اور شاید یہ مصنف کی مجبوری بھی تھی کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اس سے متعلق رہا ہے۔اس کتاب کی نثر کی زبان صاف و شفاف، اظہار بیان میں ندرت اور شگفتہ نثر آلائشوں سے پاک وصاف ہے۔اس کے علاوہ دہلی کا ادبی وتہذیبی منظر نامہ، ادبی شیرازہ بندی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور حلقہ احباب کے تذکرے کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے کے وقت رفعت سروش نے ان کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے ہیں یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔اس آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ذاتی تعصّبات سے بالکل عاری ہیں اور بنیادی طور پر حوصلہ افزائی اور محبت آمیزی کے مرقعے پیش کیے ہیں۔مگر پھر بھی ان میں تنقیدی بصیرت کارفرماں ہے۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رفعت سروش کی ادب اور ادب کی ارتقا پر کتنی گہری اور وسیع نظر ہے اور کس حد تک تنقیدی شعور کے مالک ہیں بشیر بدر کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر بشیر بدر کا ذکر ایک ایسے شاعر کا ذکر ہے جس نے اپنے

احساس برتری کا خود بار بار اظہار کر کے اہل نظر کو محو حیرت کر دیا ہے کہ کیا اس قدر خود اعتمادی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ آج کے شاعر میں بشیر بدر روش عام پر چلنے کے قابل نہیں، انہیں کسی رزم وزم سے کوئی سروکار نہ رہا، اور نہ کوئی تحریک ان کے پائے فکر میں زنجیر ڈال سکی۔ انہوں نے جدید ترین لہجے میں مقدور بھر نامانوس الفاظ کی شمعیں جلا کر غزلیں کہیں اور سیدھے پاکستان کے جدت پسند رسالوں میں بھیجیں اور قارئین و ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان دنوں وہ ہندوستان کم آمیز رہے۔ بس وہ تھے اور پاکستانی رسالے۔'' ۲۸

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''نارنگ صاحب کو آج جو عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے وہ گذشتہ بیس پچیس سال میں دو چار حضرات ہی کے حصے میں آئی ہے۔ ماہر لسانیات بھی اور ماہر لسّانیات بھی۔ لکھیں تو نکات اندر نکات پیدا کریں اور بولیں تو جادو جگائیں۔ جتنی کتابیں ان کے قلم سے نکلی ہوں گی اتنی ہی کتابیں ان زرخیز ذہن نے دوسروں کو آمادہ تصنیف کر کے لکھا ڈالیں اور ان پر فاضلانہ مقدمات سپرد قلم فرما کر ترتیب کو تخلیقات سے قریب کر دیا۔ گذشتہ پندرہ بیس سال میں جس تیزی سے اردو زبان انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے گوشوں میں پھیلی ہے اسی تیزی سے گوپی چند نارنگ کی شہرت پھیلی ہے۔ آج کوئی ادبی کانفرنس اور سیمینار نارنگ صاحب کی شمولیت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی مقبولیت انہیں چین اور سویت روس بھی لے گئی۔ گویا آج وہ مشرق و مغرب کے مقبول ادیب و دانشور ہیں۔'' ۲۹

اس آپ بیتی میں رفعت سروش نے اپنی شریک حیات کا ذکر بڑے موثر اور جذباتی انداز میں کیا ہے اور ان کی بے وقت جدائی پر ان کے قلم نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔

رفعت سروش نے اس آپ بیتی میں ابواب کو موضوعات کے دائرے میں محیط کیا ہے۔ یہ خودنوشت سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ برعظیم ہندوستان و پاکستان اور خاص کر دہلی کے سیاسی، مجلسی، علمی، ادبی، تہذیبی رجحانات اور تحریکات کی ایک دلچسپ داستان بھی ہے۔ یہ کتاب اپنے اندر ایک جہان بسائے ہوئے ہے۔ اس میں دہلی اور دہلی میں بسنے والے ہی نہیں بلکہ دہلی میں کام سے آنے والے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ عراق، پاکستان، اور سعودی عرب کی سرزمین، حجاز مقدس، مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، منیٰ، عرفات کا تذکرہ وہاں کے حالات اور جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' رفعت سروش کی تخلیقی نثر نگاری کا قابل قدر فن پارہ ہے، جس میں سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ خوشگوار یادوں کے چراغوں کی روشنی، احساسات و جذبات کے جھونکوں کی خوشبو، اور ایک پورے عہد کا جھلمل کرتا ادبی منظر نامہ ہے۔ اس آپ بیتی میں دو تین نسلیں سانس لے رہی ہیں۔ اور بہت سے ایسے لوگوں کے خدوخال بھی ملتے ہیں جو تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ بلاشبہ یہ خودنوشت ہماری ادبی تاریخ کی ایک اہم دستاویز ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا:۔ رفعت سروش ایک آدمی کا نام نہیں بلکہ ایک انجمن کا نام ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، اوپیرا نگار اور ڈرامہ نگار سب کچھ ہیں۔ ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' ایک ایسے شاعر کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو اس سے پہلے ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' اور ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' جیسی خودنوشت سوانح عمریاں لکھ کر اپنی انفرادیت کا احساس دلا چکا ہے۔ یہ آپ بیتی رفعت سروش کی انیس (۱۹) سالہ زندگی کی داستان ہے۔ اس میں ان کی پیدائش سے لے کر ۱۹۴۵ء میں دہلی چھوڑنے تک کے واقعات و حالات قلم بند ہیں۔ جس میں سب سے زیادہ توجہ انہوں نے بچپن کے حالات و واقعات پر دی ہے۔

''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' ہئیت کے اعتبار سے نامکمل خودنوشت سوانح کے زمرے میں آتی ہے۔ کیونکہ مصنف خودنوشت کے آخر میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اب بمبئی کی بزم آرائیاں میری منتظر ہیں۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ آپ بیتی نہ مذہبی ہے اور نہ سیاسی، بلکہ یہ ایک ادبی خودنوشت سوانح ہے۔

اس خودنوشت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ رفعت سروش کی پیدائش دیہات میں ہوئی

اور پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ دیہات کے تالاب میں نہانا، بھینسوں کے پیٹھ پر سواری کرنا، دن بھر میلے وغیرہ گھومنا، موانہ ونگینہ کے رسم ورواج، تہذیبی وادبی زندگی اور اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات وواقعات کے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ دیہی وقصباتی تہذیب پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ پورا عہد ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور چونکہ مصنف کی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی اس لیے وہاں کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاندان کی معاشی حالت بہتر نہ تھی۔ مالی آسودگی کے علاوہ خاندانی وجاہت کے دوسرے ذرائع بھی انہیں حاصل نہ تھے جس کی وجہ سے انہیں ہمیشہ جدوجہد کرنی پڑی اور زیادہ تر کامیاب بھی رہے۔ مصنف نے اس آپ بیتی کو اپنی حقیقت بیانی کی وجہ سے ایک عمدہ اور قابل مطالعہ کتاب بنادیا ہے۔

رفعت سروش کے بچپن کا زمانہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں سیاسی اتھل پتھل تھی اور ہر جگہ کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسے جلوس ہوا کرتے تھے، بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ چونکہ بچپن کا زمانہ تھا اس لیے ایسے سیاسی جلسے جلوس میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مصنف نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنی ذات کو الگ رکھ کر حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ رفعت سروش نے اس دور کو بڑی احتیاط کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور صرف انہی واقعات وحالات اور کرداروں تک اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے، جو ان کی نجی سرگذشت سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس دور کا پورا منظر ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ اس دوران سروش اسکول اور تعلیم کے دوسرے مراحل سے گزر رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران دہلی پہونچے اور وہاں کی مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور جنگ کے دوران جس قسم کے عارضی ادارے بنے ان میں ملازمت کا مزہ بھی چکھا۔

خودنوشت سوانح حیات میں اپنی زندگی کے حالات وواقعات بے کم وکاست لکھنا بڑی جرأت مندی اور بے باکی کا کام ہے۔ رفعت سروش اپنی خودنوشت میں 'اعتراف' کے عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ''مگر حقیقت حال کی منزل کی راہ بہت مشکل ہے۔ اپنے ہم نشینوں، ہم جلسوں اور ہم مشربوں کو ہی نہیں اپنے آپ کو بھی واقفیت اور تنقید کی دھار پر رکھنا بہت مشکل ہے۔ لیکن میں نے جب قلم اٹھایا تو خوف فساد خلق کو دل سے نکال دیا اور جو ذہن کی جولان گاہ اور قلم کی زبان تک آیا اسے ناگفتہ نہیں رہنے دیا۔'' [۳۰]

''پتہ پتہ بوتا بوٹا'' میں رفعت سروش نے حقائق کے ساتھ اپنے بچپن کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ چونکہ بچپن کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانے کی اچھی اور چلبلی باتیں یاد رہ جاتی ہیں اور دکھ درد کو بھول جاتے ہیں، مگر اس کے برخلاف سروش کو اکثر باتیں یاد ہیں اور انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ ایک جگہ موانہ سے مع سب گھر والوں کے نگینہ جانے اور گھر میں داخل ہونے کی منظر کشی کرتے ہیں۔ ان کے ہر جملے سے یہاں درد ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور آنکھیں اشکبار ہوئے بغیر آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لکھتے ہیں:

> ''مجھے یاد ہے وہ لمحہ۔۔۔ پہلے سال جب موانہ سے ہم نگینہ گئے تو گھر میں گھستے ہی سب بھائی میاں اور بھائی جان سے لپٹ گئے۔ میں دروازے میں ہی ٹھٹھک کر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اماں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔۔۔ ارے میرا شوکت کہاں ہے۔۔۔ اور جب وہ میری طرف بڑھیں تو میں ایک دم رو پڑا۔ وہ منظر میری نظروں کے سامنے آکر ایسا ٹھہر گیا ہے کہ یہ الفاظ رقم کرتے وقت بھی اسی عالم میں کھڑا ہوں۔ دروازے کی دیوار سے لپٹا ہوا بے یارومددگار سا۔۔۔ ٹھہرئے آنسو پونچھ لوں۔'' [۳۱]

''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' میں غیر ضروری قصّے چھیڑنے کے مواقع تو بہت ملے ہیں، مگر رفعت سروش فوراً ہی محتاط ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی امتیاز کا ذکر بڑی شدومد کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ان سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

> ''بھائی میاں کی قوت ان کی سچائی اور دین داری تھی باعمل زندگی تھی، بھائی میاں لیڈر نہیں لڈر گر تھے۔'' [۳۲]

شوکت علی شوق نگینوی بننا اور پھر رفعت سروش۔ لیکن اس سے قبل رفعت سروش نے اپنے بچپن کی جو تصویریں کھینچی ہیں اور ان کے ذریعے اپنے خاندان کے بزرگوں اور روایتوں کے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ دیہی وقصباتی تہذیب پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ایک پورا عہد اور اس کی تاریخ سامنے آجاتی ہے اور کتاب کا رخ ذات سے کائنات کی طرف ہو جاتا ہے، جو اس آپ بیتی کا اہم وصف ہے۔

رفعت سروش کو بچپن میں تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ ایک دن بڑے بھائی مولوی امتیاز علی

صاحب نے تصویر بنانے سے منع کر دیا، اس دن کے بعد سے وہ ڈرائینگ میں دلچسپی لینے لگے، جس کی بدولت تکیوں اور ساڑیوں پر مختلف قسم کے ڈیزائن بنانے کا فن بھی آ گیا، اور اس میں انہوں نے ایسی مہارت اور قابلیت پیدا کر لی کہ یہ ڈیزائن اس وقت ان کی آمدنی کا ذریعہ بن گئے جس وقت ان کے پاس کوئی ملازمت نہیں تھی، اور دہلی میں ملازمت کے لیے پریشان حال تھے۔ کچھ دن بعد یہی ڈیزائن ان کے ذریعہ معاش رہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے نئی سڑک پر گھوم کر دیکھا کہ وہاں EMBROIDERY کی بہت سی دکانیں ہیں۔ لوگ ریڈی میڈ کڑھی ہوئی ساڑیاں اور فراکیں وغیرہ خوب کریدتے ہیں۔ میں نے بہت سے خوبصورت نقش بنائے جنہیں ساڑیوں پر کاڑھا جا سکے۔ اور انگریزی حروف تہجی پھولوں میں بنائے اور اپنا یہ مال لے کر بازار میں پہونچا۔ دو روپیہ فی نقش کے حساب سے سودا ہوا اور اس زمانے کے حساب سے ڈھیر سارے روپئے مل گئے۔ دکانداروں نے اور مال کی فرمائش کی ۔ میں نے اور نقش بنائے۔''[۳۳]

رفعت سروش دہلی میں ڈیزائن کے پہلو بہ پہلو شاعری بھی کرتے رہے، اور چونکہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے اس آپ بیتی میں ان کا یہ پہلو ساتھ ساتھ چلتا ہے، بلکہ یہ پہلو غالب ہے۔ شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی، نگینہ اور موانہ کا ادبی اور شاعرانہ ماحول، اساتذہ کی محفلیں، نوک جھونک وغیرہ کی بہت دلچسپ تصویریں اس کتاب کے ذریعے سامنے آ جاتی ہیں۔ دہلی میں ان کی ملاقات اس دور کے بعض مقبول و معروف شاعروں اور ادیبوں سے ہوئی، جس میں محمد حسن عسکری، جمیل الدین عالی، اختر الایمان، نخشب جارچوی، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، میراجی، ن۔م۔ راشد، اور ملک نسیم ظفر وغیرہ سے ملاقات ہوئی اور ان لوگوں سے رفعت سروش کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، اس آپ بیتی میں اس وقت کی دہلی کے ادبی محفلوں، مشاعروں اور مجلسوں کا ذکر ملتا ہے۔

رفعت سروش نے ترقی پسند تحریک کا ذکر ایک مناظرہ کی شکل میں کیا ہے۔ جو راجہ صاحب محمود آباد کے ایما سے خواجہ محمد شفیع اور ماہر القادری کی رہنمائی میں منعقد ہوا تھا، اور اس مناظرے میں جواب دہندگان کے طور پر سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض بھی شریک ہوئے تھے۔ اختر الایمان ان دنوں

طالبعلم تھے اور اپنے کالج کی طرف سے بہترین مقرر ہونے کے کئی انعامات جیت چکے تھے۔انہوں نے بھی اس موقعے پر ترقی پسند تحریک کی حمایت میں تقریر کی۔اس تقریر کا حال رفعت سروش نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''اختر الایمان اپنے دور کے بہترین ڈبیٹر رہے ہیں اور وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔اختر الایمان نے نہایت فراٹے دار تقریر کی اور مجمع کے رخ کو پلٹ دیا۔انہوں نے ترقی پسند کو غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے جذبات کا ترجمان بتایا اور کہا ادب اور ایک عام تحریر میں فرق ہے۔''[۳۴]

خودنوشت سوانح حیات میں اسلوب بیان ہی خودنوشت کی روح ہوتی ہے۔جہاں تک اس آپ بیتی کے اسلوب کا سوال ہے تو رفعت سروش کی جائے پیدائش اور وہ جگہ جہاں وہ پہلی بار گھر سے دور ہوئے۔موانہ اور دہلی آنے تک کے واقعات کو اپنی میں زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔تحریری زبان سے زیادہ تقریری زبان کی ترکیب کا استعمال کیا ہے۔جس طرح کے کردار ہیں اسی اعتبار سے انہیں کے مزاج کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے۔اپنے قلم کے زور سے انہوں نے ایسی مرقع نگاری کی ہے کہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں اور یہی سروش کی تحریر کا کمال ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں بڑے شہروں میں کامیاب زندگی گذارنے کا حال بیان کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور محلّوں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، کشمکش اور جدوجہد کی عکاسی ملتی ہے۔''احسان دانش'' کی آپ بیتی کے بعد یہ دوسری آپ بیتی ہے جس میں غربت کی نچلی سطح کی عکاسی کی گئی ہے۔اس میں رفعت سروش نے حقائق کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک منفرد آپ بیتی ہے اور اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

بری عورت کی کتھا: (۱۹۹۵ء) کشور ناہید

اردو خودنوشت سوانح عمریوں میں ''بری عورت کی کتھا'' کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔اگر چہ کشور ناہید نے اس آپ بیتی میں ہر سطح پر عورتوں پر کئے جانے والے ظلم اور استحصال کے لیے مرد ذات کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور مذہب پر بھی تیکھے وار کئے ہیں۔لیکن اس انتہا پسندی کے باوجود اردو ادب میں اس خودنوشت کی اہمیت مسلم ہے۔مسلم متوسط طبقے کی عورتوں کو جن مشکل حالات اور ظلم و جبر کا سامنا پڑتا ہے اس کی بہترین عکاسی عصمت چغتائی کے بعد اگر کسی نے کی ہے تو وہ

کشور ناہید ہیں۔ یہ خودنوشت صرف کشور ناہید کی ہی نہیں بلکہ پوری عورت ذات کی خودنوشت ہے۔ اس میں انہوں نے ابتدائی زمانے سے عورتوں کے اوپر مظالم کئے جانے، اس کو کمتر گردانے، مردوں کا غلام بنا کر رکھنے یہاں تک کہ انہیں جسم فروشی کرنے پر مجبور کر دینے والی پوری صورت حال کو بھی پیش کیا ہے۔ حوا، یشودھرا، زریں تاج قرۃ العین، سیفو، اینا اخماتووا، ماریہ، سیتا وغیرہ لاتعداد نسوانی کردار اس خودنوشت میں موضوع بحث بنے ہیں۔ مرد ذات کی اس سماج میں عورتوں کی حق تلفی اور ان پر ظلم و جبر کی تصویر پیش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''اندھی صفیہ بی بی نے بھی جب سوال کیا'' میرے ساتھ زیادتی ہوئی، میں حاملہ ہوئی۔ میں زیادتی کرنے والے کا نام نہیں جانتی۔ شرعی عدالت نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کے لئے ۲۰ کوڑوں اور ۱۶ سال قید کی سزا تجویز کی۔ وہ بھی سزا سن کر سرابور ہوگئی تھی۔ زمین اعتبار نہیں کرتی۔ آسمان یقین نہیں کرتا مگر پاکستان میں ہوا۔ گزشتہ ۱۴ برس میں ۱۹۷۹ء سے اب ۱۹۹۳ تک، کہ شوہروں نے بیویوں کو زنا کے جرم میں جیل بھجوادیا کہ وہ سکون سے دوسری شادی کر سکیں۔ بھائیوں نے بہنوں پہ زنا کا الزام لگایا اور ان کا حق وراثت ہڑپ کر لینے میں مردانگی محسوس کی۔ بیٹیوں کو باپوں نے زنا کا مجرم گردانا کہ وہ اپنی مرضی کی شادی نہ کر سکیں اور باپ وہ زرِ فروخت حاصل کر سکیں جس کے عوض ان کی زندگی میں آسودگی آسکے۔''[۳۴]

مشرقی بنگال (حالیہ بنگلہ دیش) میں پاکستان فوجیوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران جو ظلم و زیادتی کی۔ کشور ناہید اس کی عینی شاہد ہیں۔ پاکستان جو ایک اسلامی مملکت کے طور پر وجود میں آیا تھا، اس نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا۔ ان کی حق تلفی کی، اور ان کے بغاوت کرنے اور ایک الگ مملکت کا مطالبہ کرنے پر جس طرح ان کی عورتوں کو اپنی درندگی کا شکار بنایا۔ یہ صورت حال کسی بھی باضمیر انسان کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''یہ بات ہے ستمبر ۱۹۷۱ کی۔ مجھے سرکاری طور پر بنگال بھیجا گیا کہ بنگالیوں کے خلاف لڑنے والے سرکاری غنڈوں کے حق میں کتابچہ لکھوں۔ میں فوراً گئی۔ آگ میں کودے بغیر، جلن

اور سوزش بھی تو نہیں ہوتی۔ بوڑھی گنگا کے کنارے کیمپ بھرا تھا۔ عورتیں ہی عورتیں، کیا میں انہیں عورتیں کہوں۔ مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی پتلی پتلی لڑکیاں جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں مگر ان کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے، ان کے گھر والے کہاں تھے وہ تو رات کے اندھیرے میں سازشی اور گدار کہہ کر مار دئے گئے تھے۔۔۔ وہ بے اماں، بے جگہ، بوڑھی گنگا کی گود میں، سوکھے ہونٹ اور سوکھی آنکھیں لیے سرنگوں بیٹھی تھیں۔''[۴۴]

''بری عورت کی کتھا'' میں صرف مردوں کے ذریعے عورتوں کے استحصال کو ہی موضوع نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ پچاس ساٹھ برسوں میں ہمارا معاشرہ جن تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے اس کی عکاسی بھی اس آپ بیتی میں کی گئی ہے۔ بیل گاڑی کی جگہ اب کاریں اور موٹریں آ گئی ہیں اور چٹھی اور تار کی جگہ ٹیلی فون اور ای۔میل نے لے لی ہے۔ طرز معاشرت میں آنے والی تبدیلیوں کی جھلک اس آپ بیتی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً:

''ہر دو پٹہ گھر میں رنگا جاتا تھا۔ ہر کپڑا گھر میں سلتا تھا، سارے مصالحے تازہ پستے تھے۔ گیہوں اور چاول گھر میں کہارنیاں صاف کرتی تھیں۔ کوئی کپڑا چند دھلائیوں کے بعد، ضائع نہیں کیا جاتا تھا۔ مردانہ پاجاموں میں پیوند لگنا ایک عام بات تھی۔ پرانی چادروں کے تھیلے، تکیہ غلاف اور دستر خوان بننا بھی سگھڑاپے کی نشانی تھیں۔ عروس کے دو پٹے، دولائیوں کے ابرو کے شکل میں اور غرارے گوٹ کی شکل میں استعمال کئے جاتے تھے۔ ساری خوشحالی کے باوجود روٹی پہ سالن رکھ کر کھالینا، عام بات تھی۔ کفایت کا فلسفہ ہر جگہ کارفرما نظر آتا تھا۔ کبھی کسی ہانڈی میں سے سالن نکالنے کے بعد پانی نہیں ڈالا جاتا تھا۔ باقاعدہ روٹی سے ہنڈیا پونچھی جاتی تھی۔ ماچس کی تیلی کا استعمال تو خال خال تھا۔ صبح سویرے، ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں کرچھا پکڑا دیا جاتا تھا۔ کسی گھر

سے آگ کا انگارہ لانے کے لئے۔بس اس طرح آگ جلائی
جاتی۔'' ۴۵؎

ملک کی تقسیم بھی اس آپ بیتی کے درمیان زیر بحث آئی ہے،لیکن اس ضمن میں کشور ناہید نے تقسیم کو صحیح یا غلط ثابت کرنے یا ہندوستان یا پاکستان کی طرف داری کرنے کے بجائے ایک حقیقت پسند کی نظر سے پوری صورت حال پر نظر ڈالی ہیں۔

مشترکہ ہندوستانی تہذیب جسے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے کاری ضرب لگائی،صدیوں سے ہمارے ملک کی شناخت رہی ہے۔اپنے بچپن کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے کشور ناہید نے اس موضوع پر بھی گفتگو کی ہے۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اس زمانے میں ہندو مسلمانوں میں نہ کوئی تعصب تھا نہ دوری۔ہم سب لڑکیاں بالیاں اکٹھی جھولا جھولتی،چھتوں کی منڈیروں سے آپس میں باتیں کرتی اور اکٹھی اسکول جاتی تھیں۔سکول مشنری تھا۔استاد زیادہ تر عیسائی مشنری تھے۔ ہندو،عیسائی اور مسلمان لڑکیاں مل کر کھانا کھاتی تھیں۔ مسلمان لڑکیاں ہندی سیکھتی تھیں اور ہندو لڑکیوں کو اردو سکھائی جاتی تھی۔ڈانس کلاس میں کسی ذات کی تخصیص نہیں تھی۔ہم سب مل کر ڈانس سیکھتے تھے۔دیوالی،دسہرہ اور ہولی بھی سب مل کر مناتے تھے۔اسی طرح عیدو بقرعید پر،مبارکباد دینے والوں میں عیسائی اور ہندو سبھی شامل ہوتے تھے۔محرم بھی اسی طرح سب کے لیے محترم ہوتا تھا۔'' ۴۶؎

بین الاقوامی سطح پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم پر کشور ناہید کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔بوسنیا،صومالیہ،گھانا،فلسطین اور کشمیر وغیرہ ان کی نظر ہر جگہ جاتی ہے اور ہر مظلوم کی آہ ان کے دل نکلتی محسوس ہوتی ہے۔مثلاً:

''بوسنیا میں لوگ اپنا ہی بول و براز کھانے پر مجبور ہو گئے۔ان کے سامنے عورتوں کے ساتھ زیادتی کی گئی،صومالیہ اور گھانا میں قحط زدہ لوگ اونٹوں کی کھال کھانے پر مجبور ہو گئے۔کشمیر میں سارے گھر خالی ہو گئے۔صرف عورتیں اور بچے ہیں،مگر

بین نہیں کرتے، فلسطین اور کشمیر کی عورتیں، جو نکاح کے وقت
ہاں نہیں کہتیں، بندوقیں تھامے ہیں۔ اپنے بچوں کو خود کفن
پوش کرتی ہیں۔'' ۴۷

اس آپ بیتی میں کشور ناہید نے اظہار رائے پر ہونے والے حملے اور مختلف کتابوں پر پابندی لگائے جانے کی بھی سخت مخالفت کی ہے اور تسلیمہ نسرین سے لے کر اکرام اللہ، باگ اور فخر الزماں کی کتابوں پر لگائی جانے والی پابندی کے خلاف آواز بلند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

''بری عارت کی کتھا'' میں کشور ناہید نے اپنی ازدواجی زندگی کی کڑواہٹوں اور اپنے شوہر کی عیاشیوں اور عیاریوں سے بھی واقف کرایا ہے۔ سسرال جہاں بہو کو ایک نوکرانی سمجھا جاتا ہے۔ گھر کے سارے افراد اس سے خدمت لینا چاہتے ہیں لیکن اس کے دل کا حال جاننے والا اور اس کے دکھ میں شامل ہونے والا شاید ہی کوئی ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

'' جیٹھ، دیور، ساس، سسر، خلیہ ساس کا خاندان اور میں
۔۔۔۔ پکا پکا کر رکھو۔ کھانے والے منٹ میں چٹ، اگر کوئی
بات ہو تو فوراً حملہ، ہم پڑھنے لکھنے کو کیا سمجھتے ہیں۔ ہم کیا بے
غیرت ہیں۔ عورتوں کی کمائی کھائیں، ہائے یہ ہمارا لڑکا تو الّو کا
گوشت کھا گیا۔ اس کی تو غیرت ہی مر گئی ہے۔ یہ تو اسے کچھ
کہتا ہی نہیں، کبھی گاڑی چلانا سیکھتی ہے تو کبھی ریڈیو جاتی
ہے، کبھی شعر لکھتی ہے اور مردوں کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتی
ہے۔'' ۴۸

کشور ناہید نے اس آپ بیتی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شوہر حضرات اپنی بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ شوہر کو نہ تو بیوی کی مادی ضروریات کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی جسمانی ضرورتوں کا۔ بغیر اطلاع دیئے رات رات بھر غائب رہنا، دوسری لڑکیوں کے ساتھ وقت گذارنا، بات بات پر بیوی کو ڈانٹ پھٹکار، یہ وہ اسباب ہیں جو ہمارے سماج و معاشرے میں زیادہ شادیوں کی ناکامی کا باعث بنتے ہیں۔ جو عورتیں اس صورت حال سے خائف ہو جاتی ہیں تو وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں، جو بغاوت کی ہمت کر پاتی ہیں تو وہ طلاق لے لیتی ہیں یا انہیں طلاق دے دیا جاتا ہے اور جو ان دونوں میں سے کچھ نہیں کر پاتیں تو وہ اپنی جسمانی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ہم جنسی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کشور ناہید نے اس پوری صورت حال کا تجزیہ ایک

INSIDER کی حیثیت سے کیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''بری عورت کی کتھا'' میں ہمارے سماج ومعاشرے کی لڑکیوں اور عورتوں کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور زندگی کے مختلف مراحل میں اس کو جو تجربے حاصل ہوتے ہیں، ان تمام کو سمیٹا گیا ہے۔ کہیں کہیں کشور ناہید کا رویہ انتہا پسندانہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس آپ بیتی میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں اس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس خودنوشت کے ذریعے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ آج یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق دیئے جائیں اور ان کے ساتھ جو ظلم واستحصال ہورہا ہے اس کو بند کیا جائے اور ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر نو میں ان کے مؤثر کردار کو تسلیم کیا جائے۔

اس آباد خرابے میں: (۱۹۹۶ء) اختر الایمان

''اس آباد خرابے میں'' عہد حاضر کے ممتاز نظم گو شاعر اختر الایمان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے بچپن سے لے کر آخری عمر تک کے حالات وواقعات کو بڑی دیانتداری کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ان کی شاعری کا وہی زمانہ ہے جبکہ ترقی ترقی پسند تحریک اپنے عروج کی کہانی کو تعمیر کے راستے سے گذار کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جارہی تھی۔ ترقی پسند تحریک غزل جیسی ترقی یافتہ صنف کی بہت حد تک منکر ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود مجروح سلطان پوری جیسا ترقی پسند شاعر بھی غزل ہی کی زلف کا اسیر رہا۔ اختر الایمان نے نظم نگاری کو ہی اپنی شاعری کا وسیلہ بنایا۔

اختر الایمان کی پیدائش ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو صوبۂ اتر پردیش، ضلع بجنور موضع راؤ کھیڑی میں ہوئی۔ والد کا نام فتح محمد صاحب تھا، جو عربی، فارسی، اردو اور ہندی سے بخوبی واقف تھے اور حافظ بھی تھے۔ مسجد میں امامت کرتے تھے اور گاؤں کی مسجد میں لڑکے لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ والدہ سلیمن صاحبہ ان پڑھ تھیں۔ ایک بھائی اور تین بہنیں تھیں۔

خودنوشت سوانح حیات ''اس آباد خرابے میں'' کے مطابق اختر الایمان کی ابتدائی تعلیم گاؤں سے شروع ہوتی ہے۔ اپنے والد کی متلون مزاجی کی وجہ سے وہ کسی ایک گاؤں میں مستقل سکونت اختیار نہیں کرسکے اور گاؤں در گاؤں خانہ بدوش کی زندگی گذارتے رہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تعلیم بھی منظم طریقے سے نہیں ہوسکی۔ اختر الایمان بڑے جرأت مند آدمی تھے اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ دہلی آکر ان کی تعلیم میں استقامت سی آجاتی ہے۔ اور قابل ومشفق اساتذہ کی شفقت انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتی

ہیں۔

دہلی کی ابتدائی زمانے میں انہوں نے موید الاسلام یتیم خانے میں جہاں پر مجرم، لاوارث اور دماغی حالت سے عاری بچوں کو رکھا جاتا تھا، کئی سال گذارے۔ یہاں پر ان کے ساتھیوں میں خورشید الاسلام بھی تھے۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موید الاسلام سے متعلق میں نے ذہنی مریضوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ تو اس زندگی کا ایک حصہ ہے وہاں کئی اور لڑکے تھے۔۔۔۔ مگر آگے چل کر سوائے خورشید الاسلام کے سب لاپتہ ہو گئے۔ خورشید الاسلام علی گڑھ چلے گئے تھے اور ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی۔ کر کے وہیں شعبۂ اردو میں کام کرنے لگے تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔''۴۹

اختر الایمان نے اپنے عربک کالج کے ساتھیوں میں سے مشتاق یوسفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' مشتاق یوسفی کراچی میں ہیں۔ اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا شمار آج کے بڑے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔''۵۰

شروع ہی سے اختر الایمان کا تعلق وضع وضع کی لڑکیوں اور عورتوں سے رہا۔ جس کا ذکر انہوں نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''ان کا نام مسز مچل تھا، نیم انگریزی نسل کی خاتون تھیں اور عرف عام میں ممی کہہ کر بلائی جاتی تھیں۔ بڑا مسکراتا ہوا چہرہ، جس پر اب جھریاں نظر آنے لگیں تھیں، اپنی جوانی میں ضرور خوبصورت رہی ہوں گی، بڑی حاجت روا قسم کی خاتون تھیں۔ جسے جب جو چاہا مل جاتا تھا۔ ٹھرے سے انگریزی شراب تک اور گھاٹن سے اینگلو انڈین لڑکی تک۔''۵۱

اختر الایمان ایک ہونہار اور ممتاز شاعر تو تھے ہی اس کے ساتھ ہی وہ اچھے مقرر بھی تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے، جو سو فی صد درست ہے۔ جس کی مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جہاں پر وہ بحیثیت مقرر دہلی سے آئے تھے اور اسٹریچی ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو مجمع پر چھا گئے۔ رشید احمد صدیقی بحیثیت جج تھے اور اختر الایمان کو اول انعام کا مستحق قرار دیا۔ بعد میں جب اختر الایمان علی گڑھ میں ایم۔اے کرنے کی غرض سے آئے تو ان کی پذیرائی ہوئی، جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے:

''علی گڑھ میں پزیرائی کا سبب رشید احمد صدیقی تھے۔ وہ
میرے بڑے مہربان تھے۔ ان سے پہلی ملاقات یونیورسٹی
کے سالانہ تقریری مقابلہ کے وقت ہوئی۔''۵۲

رشید احمد صدیقی اختر الایمان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مگر اختر الایمان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی جس کی وجہ سے ایم۔اے کا کورس پورا نہ کر سکے۔ اور اس کورس کو نا تمام چھوڑ کر تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف ریاستوں کے خاک چھاننے کے بعد بالآخر پہلے پونہ اور پھر بمبئی فلمی دنیا میں بحیثیت مکالمہ نگار مشہور و معروف ہوئے۔ آج بھی ان کے لکھے ہوئے مکالمے لوگوں کی زبان پر ہے۔

قیام علی گڑھ کے دوران ایک دلچسپ مکالمہ اختر الایمان اور ابواللیث صدیقی مرحوم (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد تھے) کے درمیان ہوا۔ اسے انہیں کی زبان سے سنئے:

''کیا تمہاری شاعری کو کلاسیکی کہا جا سکتا ہے''؟۔۔۔۔
ابواللیث صاحب! میرے جواب سے پہلے کیا یہ جان لینا
ضروری نہیں کہ کلاسیکی شاعری کیا ہوتی ہے اور اس کی تعریف
کیا ہے؟''
''جیسے فاؤسٹ'' انہوں نے جواب دیا۔
''تعریف نہیں یہ تو مثال ہے'' میں نے جواب دیا۔
انہوں نے برجستہ کہا، ''میرا مطلب ہے۔۔۔۔ جیسے ڈیوائن
کامیڈی،
''یہ دوسری مثال ہے تعریف پھر بھی نہیں ہوئی'' میں نے کہا۔
اس مرتبہ انہوں نے دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں کو ملا کر ہوا
میں نصف دائرہ بنایا۔ یہ کہتے ہوئے۔
''کلاسیکی شاعری سے میری مراد ہے''
''یہ نصف دائرہ ہے میں نے کہا تعریف پھر بھی نہیں ہوئی''
اس مرتبہ انہوں نے جواب میں اپنی انہی انگلیوں سے خلا

میں پورا دائرہ بنادیا۔میں بھی اڑا رہا۔''یہ پورا دائرہ
ہے۔تعریف بتائیے کیا ہے؟''
انہوں نے جواب میں اپنی کاپیاں اٹھائیں اور کلاس چھوڑ کر
چلے گئے۔'' ۵۳

بقول ایلیٹ کلاسک کا انحصار تین اجزاء پر ہے۔ذہن یا تہذیب کی ثمر رسیدگی، زبان کی ثمر رسیدگی اور اطوار کی ثمر رسیدگی۔اور اس میں Provinciality نہ ہو۔ایلیٹ کے نزدیک دانتے کلاسک ہے، گوئٹے نہیں۔اگر اردو ادب میں دیکھیں تو میر کو Minor کلاسک اور غالب و اقبال کو Major کلاسک کہہ سکتے ہیں۔

اختر الایمان کو فن خطابت اور فن شاعری دونوں پر پوری طرح فوقیت حاصل تھی۔جس کا ثبوت اس آپ بیتی کے ذریعے ملتا ہے۔کتاب میں دلچسپ باتیں مختلف سیاق وسباق کے ذریعے کہی گئیں ہیں۔جوش ملیح آبادی کے بارے میں یہ کہہ کر انہوں نے بہت رعایت سے کام لیا ہے کہ ان کا شمار اس عہد کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے سلسلے میں یہ انکشاف بھی سنسنی خیز ہے کہ وہ دراصل شیعہ نہیں تھے بلکہ بعض شیعہ عورتوں کی محبت میں انہوں نے شیعیت قبول کر لی تھی اور آخر تک اس مسلک پر قائم رہے۔اپنے معاصرین اور دیگر شعراء کا ذکر بھی انہوں نے کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بارے میں ان کا محاکمہ بہت صاف، واضح اور مصنفانہ ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند حلقے کی نظر میں وہ تحریریں معتبر نہیں تھیں یا اہمیت
نہیں رکھتی تھیں جو اشتراکی زاویہ کے تحت نہ لکھی گئی ہوں یا ان
پر اشتراکی زاویہ حاوی نہ ہو۔۔۔۔آغاز میں ترقی پسندی کا
اطلاق ان تحریروں پر ہوتا تھا جن میں کھوکھلا پن ہو اور جو انسانی
زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کرے جن پر لکھنا عیب میں
شمار کیا جاتا ہے۔'' ۵۴

مزید لکھتے ہیں:

''انہوں نے (ترقی پسندوں نے) ادب میں دیانت داری
سے کام نہیں لیا اور اشتراکی محاذ کو اپنی ذات کی توسیع اور شہرت
کے لئے استعمال کیا۔۔۔۔۔جہاں ترقی پسندوں نے بڑے

لکھنے والوں کو نظر انداز کیا تھا، وہاں اپنی تعداد بڑھانے کے
لئے ان کو بھی سراہنا شروع کر دیا تھا، جو نثر میں اچھی صحافت
کے معیار پر بھی نہیں آتے تھے، اور شاعری میں ''موزوں گو''
سے زیادہ انہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔'' ۵۵

مزید لکھتے ہیں:

''بیشتر ترقی پسند جاگیردار اور بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے تھے
اور اپنے ادب میں وہی قدریں لے کر آئے، جنہیں وہ آگے
بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر ان قدروں کے اور ان جذبات کے
پاؤں نہیں تھے۔ ان لکھنے والوں نے مقبول ہونے کے لئے
سب کچھ کیا۔ مگر اپنے آپ کو ڈی کلاس نہیں کیا۔'' ۵۶

اختر الایمان کے اندر غرور و تکبر تو تھا لیکن تلخ کلامی نہیں تھی اور انہوں نے کبھی اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کئے، جس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہو اور نہ ہی وہ اپنے معاصرین کی طرح موقع پرست تھے۔ وہ ہر طرح کی تحریص و شوق اور جوڑ توڑ سے ہمیشہ دامن بچاتے رہے۔ انہوں نے اپنا لوہا فطری لیاقت اور اس کی قدر و قیمت کی بنیاد پر منوایا۔ ان کے محاکے عام عور پر غیر جانبداری پر مبنی ہوتے تھے۔ اختر الایمان کو عروض و ردیف و قافیے کی پابندی سے نفرت ہو گئی تھی۔

اختر الایمان فلمی دنیا میں بحیثیت مکالمہ نگار مقبول و معروف ہوئے۔ فلمی دنیا میں بھی قلم کے ساتھ آئے تھے، لیکن فلموں کے مکالمہ نگاری سے ان کی ادبی قدروں کی معیار بندی مناسب نہیں کیونکہ یہ میدان صرف ان کا مقصدی میدان تھا جہاں سے وہ روزی روٹی حاصل کرتے تھے۔ پھر بھی فلمی دنیا میں ان کی انفرادیت مسلم ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ فن کار تھے اور پیدائشی ذہین تھے۔ فن کاری ان کے ضمیر میں شامل تھی اور ضمیر کی یہ صفات شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی تخلیقات میں نمایاں ہوتی رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ وقت، گمراہ، ہمراز اور قانون جیسی فلموں کے لیے جب مکالمہ لکھتے ہیں تو انہیں اس میدان میں کافی سراہا جاتا ہے۔ اس بنا پر تماشہ بینوں کی نفسیات کے برخلاف گانوں سے مبرّا 'قانون' جیسی فلم باکس آفس پر ہٹ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی فلموں کے لیے یادگار مکالمے لکھے ہیں۔

اختر الایمان اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اس آباد خرابے میں'' میں خودنوشت سوانح کے فن کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انہوں نے زبان و بیان کو بہت ہی

حسین پیرائے میں پیش کیا ہے۔ان کی زبان بہت ہی سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔واقعات و کردار کو چند جملوں میں ہی سمیٹ لیتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔گو کہ خودنوشت سوانح میں کہیں کہیں واقعات کی بے ترتیبی نظر آتی ہے۔پھر بھی وہ اپنے انداز بیان اور اسلوب کی وجہ سے بہت حد تک کامیاب ہیں اور یہی ان کی عظیم فن کار ہونے کی دلیل ہے۔اس خودنوشت سوانح میں اختر الایمان نے Flash back کی تکنیک کا استعمال خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

فنی اعتبار سے منظر نگاری خودنوشت سوانح حیات کا ایک اہم جز و ہوتا ہے۔اور کسی بھی خودنوشت سوانح کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار منظر نگاری پر بھی ہے۔اختر الایمان منظر نگاری کے فن سے مکمل طور پر واقف تھے۔اس لیے انہوں نے اس خودنوشت سوانح میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے اس میں منظر نگاری کے فن کا اظہار بھرپور طریقے سے کیا ہے۔جس سے کہیں بھی تشنگی، الجھن یا ابہام کا احساس نہیں ہوتا۔ایک جگہ اپنے گھر کی منظر نگاری کچھ اس طرح کیا ہے۔

> ''بارہ دری خالی پڑی تھی، دیواروں اور چھتوں پر شکست وریخت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ایک حوض تھا جو سوکھا پڑا تھا۔اس کا فوارہ ٹوٹ گیا تھا۔مگر جامن، جموے کٹہل، بڑھل، لسوڑے، گوندنی، مولسری، مہوا، آم، دنیا بھر کے پیڑ اس میں تھے۔کہیں کہیں گلاب کے پودے بھی تھے۔جب مولسری کا زمانہ آتا تھا ساری بارہ دری خوشبو سے بھر جاتی تھی۔'' ۵۷

اختر الایمان افریقہ میں فلم کے سلسلے میں گئے تھے تو وہاں کی ایک شام کی منظر نگاری کچھ اس کرتے ہیں:

> ''ایسے سہانے مناظر، اتنے پھیلاؤ میں فطرت کی اس گلکاری کے ساتھ میں نے پہلی کبھی نہیں دیکھے تھے۔وادی کی گھاس ایسی نرم تھی جیسے مخمل بچھادی گئی ہو۔آگے بڑھے تو کچھ چھوٹی جھیلیں بھی دیکھیں جن میں آبی گھوڑے اور طرح طرح کے پرندے اور جانور بھی تھے۔'' ۵۸

اختر الایمان ہر جگہ طوالت سے آنکھ چراتے ہیں اور اختصار پسندی کو بڑھاوا دیتے ہیں مگر

ساتھ ہی ساتھ جس کے بارے میں ذکر کرتے ہیں اس کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔

''اس آباد خرابے میں'' کے ذریعے اختر الایمان کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ نہایت پر کشش ہے۔ابتدائی زندگی کے ناخوشگوار حالات اور واقعات بعض اوقات ترشی و تلخی پیدا کر دیتے ہیں۔اختر الایمان کی شخصیت میں تلخی ،نفرت اور کلبیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ان کی کشادہ دلی اور عالی ظرفی کا عالم یہ تھا کہ کوئی بھی ضرورت مند دوست ،رشتہ داران کے یہاں آکر رہ سکتا تھا،اور ان کی مہمان نوازی وفراخدلی سے سرفراز ہوسکتا تھا۔ان کے احباب و دوستوں میں نہ صرف ہم عصر شعراو ادبا شامل تھے بلکہ وہ لوگ بھی تھے جو فلمی زندگی میں ان کے شریک کار تھے۔ان کی دوستی اور مہمان نوازی کا اس سے اچھی مثال اور کیا ہوسکتی کہ انہوں نے میراجی کے لیے ترقی پسند مصنفین کی مخالفت کا سامنا کیا اور کافی مدت تک اپنے گھر میں رکھے۔میراجی جس قسم کے آدمی تھے ان کو گھر میں رکھنا آسان کام نہیں تھا۔

خودنوشت سوانح حیات کو آگے بڑھانے کے لیے جہاں یادداشت کی ضرورت پڑتی ہے وہیں ڈائری بھی بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ویسے اختر الایمان نے اسے اپنی خودنوشت سے منسوب نہیں کیا ہے بلکہ 'یادداشت' کہا ہے اور یادداشت اگر ڈائری کی شکل میں موجود ہو تو یادداشت کو بھی تقویت ملتی ہے۔جو ایک خودنوشت سوانح کے لیے بہت ہی مثبت اور کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔چونکہ اختر الایمان نے جابجا ڈائری سے استفادہ کیا ہے اس لیے انہوں نے کئی دنوں کی ڈائری بھی بغیر کسی تبدیل کے نقل کر ڈالی ہے، جو خودنوشت کی خوبی اور خامی دونوں ہوسکتی ہے۔لیکن خامی اس لیے نہیں کہہ سکتے کیونکہ جہاں کہیں بھی وہ خودنوشت سوانح لکھتے وقت رکتے ہیں وہاں ڈائری ان کا ساتھ بحسن خوبی نبھاتی ہے اور خودنوشت سوانح کو آگے بڑھانے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اختر الایمان چونکہ فلموں سے وابستہ رہے جس کی وجہ سے بیرون ممالک کا سفر کرتے رہے مگر کوئی سفر نامہ نہیں لکھا۔لیکن اپنے سفر کا ذکر خودنوشت میں ہمیشہ کرتے نظر آتے ہیں جو ڈائری کی شکل میں اس خودنوشت میں موجود ہے۔سفر کے حسین واقعات و مناظر سے قاری کو روشناس کراتے ہیں جس کی وجہ سے کسی قسم کی بوریت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ایک جگہ انہوں نے ''میری این تواینیت کی محل' جو فرانس کے حلقے میں ہے اس کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''محل کے نیچے حوض اور شہر کا منظر بہت خوبصورت ہے اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو کہیں مصوری کے اعلیٰ نمونوں سے مزین کیا گیا ہے اور کچھ قالینوں اور خاص طور پر بنائے ہوئے

مخمل سے اکثر جگہ تصویروں عورتوں کے سینے کھلے ہوئے
ہیں''۵۹

اختر الایمان واقعات کو بیان کرنے میں زمان ومکان کا خیال رکھتے ہوئے اپنے منفرد اسلوب میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہیں بھی جملے کی حسن کاری میں کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خودنوشت کے ذریعے اختر الایمان نے اپنے بچپن کے حالات، ابتدائی تعلیم، باغوں میں ٹہلنا، جنگل میں سو جانا، ہل چلانا، فصل کاٹنا، گائے وبھینس چرانا اور دودھ بیچنے وغیرہ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں والد کے ساتھ کبھی اِس گاؤں تو کبھی اس گاؤں گھومتے رہے۔ دہلی میں یتیم خانے کی زندگی، پھر دلی کالج، علی گڑھ کی طالبعلمی اور تلاش معاش میں یونیورسٹی چھوڑ کر پونے کا سفر اور پھر بمبئی میں پے در پے ناکامیوں سے سابقہ، فلم کی زندگی کی تمام تر تفصیلات اس خودنوشت میں ملتی ہے۔ واقعات کے بیان میں اختر الایمان نے حق گوئی اور صداقت سے کام لیا ہے۔ لیکن واقعات کی تکرار قاری کو کھٹکتی ہے۔ اس خودنوشت سوانح کی خوبی یہ ہے کہ بچپن سے لے کر خودنوشت لکھتے وقت تک کی زندگی کے بے شمار تجربات اور واقعات کو بڑی سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ اس میں ان کی زندگی کے معمولی وغیر معمولی دونوں طرح کے واقعات ملتے ہیں۔ انہوں نے شخصی تعلقات کے اظہار میں بڑی حد تک سچائی سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر اسے ایک کامیاب خودنوشت سوانح حیات کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی: (۱۹۹۶ء) ادا جعفری

ادا جعفری کا نام ہندوستان و پاکستان کی شاعرات میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آ کر قارئین سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا تعلق بدایوں سے ہے، جس خاک سے کئی بزرگان دین، بادشاہ اور اردو کے بڑے بڑے شعرا و ادبا کا تعلق ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''کیسے کیسے صوفیا، اہل علم، اہل فکر اور اہل دل اس خاک میں آسودہ ہیں۔ عہد اکبری کے عالم، شاعر اور مؤرخ عبدالقادر بدایونی، سالار مسعود غازی کے استاد میر ملہم شہید معروف بہ میراجیؒ، خواجہ حسن شاہی موئے تاب معروف سلطان العارفینؒ، سلطان العارفین کے بھائی شیخ بدرالدینؒ جو خواجہ بختیار کاکیؒ کے ہم عصر تھے اور شاہ ولایتؒ کے لقب سے مشہور

تھے۔''[۶۰]

اس کے علاوہ بھی کئی بزرگ ہستیاں ہیں جن کا تعلق بدایوں کی سرزمیں سے ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ جن کا بچپن بدایوں میں گذرا۔ سلطان علاؤالدین کا روضہ بھی یہیں پر ہے جو لودھی خاندان کا پیش رو تھا۔ اس کے علاوہ کئی بزرگ ہستیاں اور سلاطین کا مزار ہے یہاں پر۔ اردو کے بڑے بڑے شعرا و ادبا اس سرزمین سے پیدا ہوئے۔ آج یہ شہر ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر میں بھی مشہور و معروف ہے۔

''جو رہی سو بے خبری رہی'' آداؔ جعفری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس آپ بیتی میں اس دور کا تہذیب و تمدن، طرز فکر اور طرز معاشرت وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ مصنفہ نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں عورت ذات پر مرد ذات کا مکمل غلبہ تھا۔ وہ ان روایات میں جکڑی ہوئی تھیں جو خود مردوں کی وضع کردہ تھیں۔ ان میں کچھ تو اچھی تھیں لیکن کچھ ایسی روایتیں بھی تھیں جہاں عورت اپنے حقیقی جذبات و احساسات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو جلا بخش سکتی تھی۔ آداؔ جعفری نے اسی ماحول میں اپنے آپ کو منوایا۔ انہوں نے بدایوں کے علمی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی دائروں میں رہتے ہوئے تنگ ماحول میں وہ کھڑکیاں کھولیں جن سے تازہ ہواؤں کو راستہ ملا۔

آداؔ جعفری نے اپنے بچپن کی یادوں کو شروع کے ابواب میں جس طرح تشکیل نو کی ہے اس سے ان کے خاندانی حالات و واقعات اور اس معاشرے کی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو تقسیم ہند سے قبل مسلمانوں کے متوسط طبقے کا معاشرہ اور تہذیب تھا۔ مصنفہ نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے ان ساری باتوں کو بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی Authenticity قائم ہوتی ہے، اور خودنوشت کے لیے حقیقت بیانی بہت ضروری ہے کیونکہ سچائی و حقائق اس فن کا ایک اہم حصہ ہے۔

اس آپ بیتی کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مصنفہ نے اپنے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات بھی بیان کیے ہیں۔ خصوصاً غیر ملکی اسفار کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ملتا ہے۔ لیکن اس میں روایتی سفرناموں والی کوئی بات نہیں ہے بلکہ سفر کے انہیں پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے جو مصنفہ کے لیے حیرت و استعجاب کا باعث بنے تھے اور اس حیرت و استعجاب میں قاری بھی برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

''جو رہی سو بے خبری رہی'' کو شخصیات کا نگار خانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بلا مبالغہ سو

ڈیڑھ سو افراد کا ذکر ہے۔ لیکن کسی کے بارے میں بھی چند سطروں سے زیادہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کوئی اہم بات لکھنے سے نہیں رہ گئی ہے۔ چند سطروں میں ہی موضوع کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ شخصیت نگاری کے حوالے سے اختصار اور جامعیت کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی دوسری جگہ نظر آئے۔

مصنفہ نے اپنی ابتدائی زندگی اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات وحادثات پر تفصیل سے لکھا ہے، اور ایک شاعر کی طرح محسوس کر کے لکھا ہے۔ انہوں نے اس وقت کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ ماحول کا نقشہ بہت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ عورت اس دنیا میں مردوں کی جاگیر اور غلام تھی۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں اس کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''مرد تھے جن کی جنبش ابرو پر زندگی بھر کی خوشیوں یا محرومیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بی بیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کے احکام کا درجہ دیتی تھیں۔''[۶۱]

آگے لکھتی ہیں:

> ''مرد کے پندار برتری نے عورت کے علم وآگہی کے ورثے کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور مدتوں عورت احساس محرومی سے بھی محروم رہی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر زمرد کا گلوبند ادراک حیات سے زیادہ قیمتی تھا، یوں بھی جاگیرداری نظام میں یہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زیرنگیں مخلوق کو کس حد تک شرف دینا چاہتا ہے۔ اور مرد کو عورت کے ذہن یا اس کے علم کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔''[۶۲]

اس آپ بیتی کے اندر آدا جعفری کی مختلف تصویریں نظر آتی ہیں۔ پہلی تصویر بدایوں کی الجھے سلجھے بالوں والی اس کمسن، تنہا تنہا اور اداس لڑکی کی ہے، جس کی پوری دنیا اس پھاٹک کے اندر آباد تھی۔ جسے ٹونک والوں کا پھاٹک کہتے تھے اور جہاں زنجیروں کو بھی دستک کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری تصویر اس آدا کی ہے جس کی آنچل میں زندگی نے ساری خوشیاں ڈال دی تھیں۔ اسے آدا نے اپنا دوسرا جنم کہا ہے۔ دونوں تصویریں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بہت مماثلت رکھتی ہیں اور ایک میں دوسری کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔

آدا جعفری نے اس آپ بیتی میں تقسیم ملک سے ہونے والے فسادات کا ذکر بھی کیا ہے اور اس دردناک ماحول کی عکاسی ایسے کی ہیں کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لکھتی ہیں:

''زندگی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا مگر کتنی بے رحمی کے ساتھ۔ فسادات کی آگ وقت کا ہاتھ تھامے پھیلتی چلی جارہی تھی۔ ۴۶ء میں پہلے بہار میں اور اس کے بعد میرٹھ کے قریب گڑھ مک ٹیشر کے میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور پھر پورا ملک ایک سیل بے پناہ میں گھر گیا۔ انتقام در انتقام کا ایک ایسا دائرہ تھا جس میں انسانیت سر برہنہ اور محبت سرمہ در گلو تھی۔ ۴۷ء میں انسان آگ اور خون، نفرت اور خوف کے جس عفریت سے دوچار ہوا اس کی یاد بھی اذیت ناک ہے۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں، مذہب کے نام پر فسادات ہورہے تھے۔''[۶۳]

آگے لکھتی ہیں:

''اور پھر پورا ملک فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ شہر میں اندھیرے اجالے قتل کی اکا دکا واردات شروع ہوچکی تھی جس میں شدت اس وقت آئی جب پنجاب سے لٹے پٹے غیظ وغم میں ڈوبے ہوئے سکھ شرنارتھیوں کے قافلے وہاں پہونچے۔ ابھی لوگ اپنے بچاؤ یا نقل مکانی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک پورے شہر میں خوں ریزی روز شب کا دستور بن گئی۔''[۶۴]

آزادی سے چند ماہ قبل آدا بدایونی کی شادی نورالحسن جعفری سے ہوگئی اور ادا بدایونی، آدا جعفری ہوگئیں۔ نورالحسن سرکاری ملازم تھے اور تقسیم کے بعد انہوں نے پاکستان میں ملازمت کا انتخاب کیا اور کراچی چلے گئے۔ جعفری کو فرائض کے سلسلے میں مختلف ملکوں میں قیام کرنا پڑا۔ ان کے ساتھ آدا جعفری کو بھی دنیا گھومنے کا موقع ملا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں، مدبروں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ جس کی تفصیل انہوں نے اس آپ بیتی میں بیان کی ہے۔ ان کے اظہار بیان میں تازگی اور ندرت پوری طرح منعکس نظر آتی ہے۔

ادا جعفری کو پاکستان میں اپنی اظہار ذات اور علمی و ادبی ذوق کی نشو نما اور پرورش و پرداخت کے لیے بدلا ہوا منظر ملا اور اس نئی فضا میں انہیں زیادہ مواقع ملے۔ نجی و خانگی زندگی کے نشیب و فراز کے باوجود انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر کو نکھارا اور وقتاً فوقتاً ان کے شعری مجموعے شائع ہوتے رہے اور رفتہ رفتہ وہ توجہ کا مرکز بنتی چلی گئیں۔ ادا جعفری کی شاعری میں جس طرح دھیما پن اور آگہی ملتی ہے وہی کیفیت ان کی نثر میں بھی ملتی ہے۔ نثر کا اسلوب بہت خوبصورت ہے اور یہ ان کی شاعری سے پوری طرح آہنگ ہے۔ ہم ان کی شاعری کو ان کی نثر میں بھی کہیں کہیں تلاش کر سکتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کسی خوبصورت منظر کا نقش ابھارنے کے لیے کئی جگہ اپنی شاعرانہ حسیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مثلاً:

> ''فاصلے سے دیکھا تو جیسے سفید بدلیوں کے ساتھ آسمان کا کوئی ٹکڑا زمین پر بچھا ہوا ہے اور پاس پہنچے تو دو پہاڑوں پر دمکتی ہوئی برف اب ہمارے قدموں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھی اور سامنے سیف الملوک جھیل کا مٹیالا پانی ہمیں تک رہا تھا۔ اجلی دھوپ اور ہوا میں پاکیزگی سی، جھیل کے آس پاس بکھرے ہوئے پتھروں کے درمیان برف کی قربت سے بے نیاز چھوٹے چھوٹے پودے جن کے سبز پتوں کی ہتھیلیوں پر اودے اودے پھول سجے ہوئے تھے۔ سامنے ایک سرخ رنگ کا چائے خانہ بھی کسی نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔''[۶۵]

اس آپ بیتی میں ایسے ہی دلکش اور خوبصورت اقتباسات کئی جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ یورپ، امریکہ اور روس کے ان تمام قابل ذکر مقامات کا جغرافیائی منظر نامہ بھی انہوں نے بڑی خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے، اور وہاں کے علمی و ادبی فضا کا نقشہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کھینچا ہے۔

ادا جعفری نے جس ملک کا بھی سفر کیا وہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک ایک پہلو انہوں نے اپنے لفظوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ یہ خود نوشت ان کے اپنے کئی چھوٹے چھوٹے سفر نامے بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔

ادا جعفری نے اپنے دورۂ روس اور خاص طور سے دوشنبے اور تاشقند وغیرہ کی جو روداد سفر لکھی ہے وہ کافی دلچسپ ہے، اور یہی حال ان کی سیاحت ترکی کے انداز بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ

حرمین شریفین کی زیارت اور جبل نور کا ذکر جہاں پر ان کے جذبات سرتاسر عقیدت ومحبت سے مملو ہیں۔ وہ غار حرا میں بھی تشریف لے گئیں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا وقت مراقبے میں گذارتے تھے۔ وہاں کا ذکر بھی انہوں نے انتہائی ادب واحترام اور تشویق کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا ہے، جن سے ایک روحانی کیفیت اور وجد کی حالت پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے۔

اس آپ بیتی میں ادا جعفری نے کسی شخص کے تذکرے کے ضمن میں تلخی، عیب جوئی اور طنز واستہزا کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ جبکہ زندگی میں اچھوں اور بروں، بہی خواہوں اور بدخواہوں سبھی سے واسطہ پڑتا ہے، بلکہ برے کچھ زیادہ ہی راستہ کاٹتے ہیں۔ مگر ادا جعفری کو کسی شخص میں کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آئی۔ شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں عظیم اور اہم جیسے الفاظ کا استعمال بے دریغ کیا ہے۔ اور کسی کے خلاف بھی انہوں نے زہر نہیں اگلا ہے۔ خودنوشت کے آخر میں لکھتی ہیں:

> ''ایسا نہیں تھا کہ مجھے کبھی کسی سے دکھ نہ پہنچا ہو۔ دوستوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں سے واسطہ رہا ہے۔ مگر جن باتوں نے دل کو دکھایا انہیں اپنی یادوں میں شریک کیوں رکھا جائے۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے اور عفو ودرگذر میرے مولا کی صفت ہے اور اسے پسند ہے۔''[۶۶]

ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا۔

مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آئے ہیں اکثر دعاؤں میں۔ [۶۷]

ادا جعفری نے پاکستان کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور اس میں ملوث شخصیتوں کا ذکر بڑی درد مندی کے ساتھ کیا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی حالات بھی ان سے ڈھکے چھپے نہیں تھے، پھر بھی انہوں نے طنز واستہزا جیسے جملے کبھی استعمال نہیں کیے ہیں، بلکہ اس کے برعکس انصاف پسندی اور ہمدردی کا لہجہ اپنایا ہے، جو ایک قابل ستائش رویہ ہے اور اس سے ان کی نیک نیتی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ہم عصر شعرا وادبا اور اہل قلم کا ذکر جا بجا کیا ہے، اور اس ذکر میں کہیں بھی کسی سے بھی نہ کوئی گلہ کیا اور نہ ہی کوئی شکایت کی، بلکہ اپنے معاصرین کا ذکر انہوں نے محبت اور اپنائیت سے کیا ہے۔

ادا جعفری کے مشاہدے اور تخیل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے اس آپ بیتی میں مختلف دلکش ودیدہ زیب تصویریں بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے انداز بیان میں جو شائستگی،

شرافت اور تہذیب ہے وہ قابل تعریف ہے۔ان کے ہاں نرمی، حلاوت اور شیرینی ہے لیکن یہ مٹھاس کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس خودنوشت کو ایک کامیاب خودنوشت اس لیے بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادا جعفری نے اپنی زندگی کے تقریباً ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کے باوجود صرف اپنی ذات کو ہی توجہ کا مرکز نہیں بنایا ہے بلکہ اپنے پورے عہد و ماحول، اعزہ واحباب سبھی کے ساتھ انصاف کیا ہے۔کسی کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔اس کے علاوہ جو شئے اس خودنوشت کو بار بار قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہے وہ ہے اس کی صاف ستھری زبان، دلکش انداز بیان اور دھیمی دھیمی نغمگی میں ڈوبا ہوا لہجہ۔یہ ایک ایسے فن کار کی آپ بیتی ہے جو بنیادی طور پر شاعر ہے اور جس نے نثر میں تمام شعری وسائل سے کام لیا ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادا جعفری کی خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اپنے انداز فکر، انداز نگارش اور انداز پیش کش ہر اعتبار سے دلکش ہے، اور بلا خوف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ خودنوشت، اردو خودنوشت سوانح عمریوں کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔

جنت سے نکالی ہوئی حوا: (۱۹۹۸ء) نفیس بانو شمع

''جنت سے نکالی ہوئی حوا''، نفیس بانو شمع کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔نفیس بانو شمع کی شناخت کئی حوالوں سے ہوتی ہے۔اولاً افسانے لکھے، پھر شاعری کرنے لگیں اور اس میدان میں خاصی مشہور و معروف ہوئیں۔اس کے بعد ان کا ناول ''سماج'' منظر عام پر آیا اور اتر پردیش اردو اکادمی کے ذریعے ایوارڈ حاصل کیا۔اس کے بعد انہوں نے اپنی آپ بیتی ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' لکھ کر اردو خودنوشت سوانح نگاری کے میدان میں اپنا الگ مقام حاصل کیا۔

''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' ایک ایسی عورت کی خودنوشت سوانح ہے جس کے ہر صفحات پر عورت کے حساس دل میں موجزن جذبات واحساسات کی تصویریں چلتی پھرتی اور سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور ہمارے ذہن وشعور کو ایسے راستوں اور منزلوں سے آشنا کراتی ہے، جہاں ہمارا معاشرہ وسماج کچھ لمحہ کے لیے سوچ وفکر میں مبتلا ہو کر زندگی کی سچائیوں اور فسانوں کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''عورت ہر جگہ معتوب ہو رہی ہے کہیں اس سے پابرہنہ رقص
> کروایا جا رہا ہے، کہیں جبراً کوٹھے کی زینت بنا دیا جاتا

ہے، کبھی اسے زندہ جلانے کی کوشش ہوتی ہے، تو کبھی طلاق
کے تین پتھر مار کر اسے سنگسار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ارد
گرد عورت کے لیے کتنی صلیبیں نصب ہیں؟ کیا مصلوب ہونا
ہی عورت کا مقدر ہے؟ میں جب بھی اس سوال کا جواب تلاش
کرنے کے لیے باہر نکلی اپنا وجود لہولہان کر بیٹھی۔'' ۶۸

یہ آپ بیتی جاگیردارانہ خاندان کی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ہندوستان کو آزادی ملنے کے بعد پیدا ہوئی۔ اس وقت زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام آخری سانس لے رہا تھا اور دھیرے دھیرے جاگیرداری اور زمینداری ختم ہو رہی تھی۔ نفیس بانو شمع کی جب آنکھ کھلی تو دولت کی فراوانی ان کے خاندان میں تھی، مگر سب سے زیادہ محبت کرنے والے دادا، دادی کے انتقال کے بعد ان پر مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ والد فوجی افسر تھے اور جاگیردارانہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لیے دوسری شادی کر لی اور پہلی بیوی یعنی شمع کی والدہ کو گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور یہیں سے شمع کی دردناک اور غم ناک زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی خوشگوار اور اچھی نہیں تھی جس کی تلخی اور مصائب کا ذکر انہوں نے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

'' کہتے ہیں دکھ کسی کو سنانے سے ہلکا ہو جاتا ہے، مگر میری سننے
والا کون تھا؟ نہ کوئی ہمدرد، نہ غمگسار، نہ ساتھی، نہ سہیلی۔ گھر کے
در و بام میری سنتے تو تھے مگر درد بانٹ نہ سکتے تھے۔ میری
سوچوں کو آخر ایک نئی راہ مل گئی۔
میں نے افسانے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنے غم کو
معاشرے کے کرداروں میں بانٹ دیا۔ رات رات بھر
کہانیاں لکھتی۔'' ۶۹

اس آپ بیتی کے ایک ایک لفظ سے شمع کا ذہنی کرب ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی نے انہیں تکلیفوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ لیکن انہیں تمام چیزوں نے ان کے اندر چھپے ہوئے فن کار کو حساس بنایا اور بات کہنے کا خوبصورت اور مؤثر انداز دیا۔ انہوں نے اپنی داستان زندگی کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں ہم ایک زندگی کے ذریعے کئی زندگیوں کے اندر جھانکتے ہیں اور ان کے حالات و واقعات پڑھ کر ہر کردار کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ جس کی ترجمانی شمع نے مختلف کرداروں کے ذریعے اس آپ بیتی میں پیش کیا ہے۔

نفیس بانو شمع نے اس آپ بیتی میں اپنی داستان حیات کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی کے حالات وواقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔شمع صاحبہ نے شعوری طور پر ان طبقات کی کمزوریوں، ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیات کو اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔فلسفیانہ اور ناصحانہ اسلوب سے عام طور پر پرہیز کیا ہے۔اس آپ بیتی میں دیہات، شہر اور قصبات کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی دیکھی جاسکتی ہے۔پوری خودنوشت پر یاس وحرماں اور ناامیدی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔مصنفہ نے انہیں واقعات وحادثات کو بیان کیا ہے جو ان کے اوپر گذری ہے۔یہ آپ بیتی صرف ایک عورت کی آپ بیتی نہیں بلکہ پوری عورت ذات کی آپ بیتی ہے۔ایک جگہ لکھتی ہیں۔

> ''آدم نے گندم کھایا تو جنت سے نکال دیئے گئے مگر اس بار آدم نے خطا کی تو اس کی سزا حوا کو ملی وہ جنت سے نکال دی گئی۔
>
> محبوبہ کی شرط تھی کہ بیوی کو چھوڑ دو اور پھر تین طلاق کے ساتھ تین بچے سوغات میں دے کر حوا پھر بربادی کی گہری کھائی میں پھینک دی گئی۔''[۶]
>
> ''ہمارے معاشرے میں ہر عورت ناچ رہی ہے۔کوئی گھنگھرو باندھ کر، کوئی بغیر آواز کے، کوئی اتم کمار کے سبق پر، کوئی خاوند کے اشارے پر، کوئی اولاد کی محبت میں، کوئی ظالم کی خوف سے۔رقص ہی عورت کا مقدر ہے۔جب وہ ناچنا بند کر دیتی ہے تو ساکت کر دی جاتی ہے اور پھینک دی جاتی ہے، کبھی آگ میں، کبھی پانی میں، کبھی قبر میں۔''[۷]

مندرجہ بالا اقتباسات میں حقیقت کی عکاسی خوبصورتی کے ساتھ کی گئی ہے۔شمع نے اس خودنوشت کے ذریعے سماج میں بے آبرو اور بے عزت ہوئی عورتوں کا ذکر بڑی بے جاں سوزی کے ساتھ کیا ہے۔سماج ومعاشرہ میں مرد عورت پر کیسے کیسے روپ تبدیل کر کے ظلم کرتا ہے، اس کا نقشہ مصنفہ نے نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے۔مرد کبھی باپ بن کر، کبھی بیٹا بن کر، کبھی شوہر بن کر اور کبھی محبوب ودوست بن کر عورت کا استحصال کرتا رہتا ہے۔مرد کی ستائی ہوئی عورت کس طرح سماج ومعاشرہ میں خوار ہوتی ہے اور اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور معاشرہ میں

رہنے کے لیے اسے کیسے کیسے مظالم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مصنفہ نے اس کا ذکر اس آپ بیتی میں خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' میں مصنفہ نے اپنی ذات کا انکشاف جوں کا توں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ شمع نے حقیقت نگاری اور دیانتداری سے کام لیا ہے۔ واقعات و حالات کے بیان میں وہ کہیں بھی جھجک محسوس نہیں کرتی ہیں جہاں بھی ضرورت محسوس کرتی ہیں واقعات کو حقیقت کے ساتھ پیش کر دیتی ہیں، چاہے اس سے ان کی نسوانیت ہی کیوں نہ مجروح ہو۔ وہ کہیں ڈر یا خوف محسوس نہیں کرتیں۔ مصنفہ کی ذات پر جو ظلم ہوا ہے اسے قدم قدم اس کا اندازہ ہوتا ہے اور اس درد کو وہ اچھی طرح محسوس کرتی ہیں اور اس درد و ظلم میں مصنفہ نے پوری عورت ذات کو شریک کر لیا ہے اور یہی اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ آپ بیتی کی ابتدا میں لکھتی ہیں:

> ''میں وہاں کی آہنی دیواریں پھلانگ کر فرار ہو جاتی ہوں، کسی راستے کا تعین نہیں تھا، کسی منزل کا خواب نہیں تھا، بس آزادی چاہتی تھی، ایک ایسی آزادی جس میں عورت اپنی جائز حقوق کے ساتھ سانس لے سکے'' ۲ے

شمع اس آپ بیتی کے ذریعے عورت کے اوپر جو مظالم ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں اس کے بیان کے ساتھ ساتھ اس جائز حقوق کا مطالبہ بھی کرتی ہیں۔ ایک عورت جو چہار دیواری میں مقید ہے، دبی کچلی ہوئی ہے، اپنی ذات کو فراموش کر چکی ہے اور اپنی جائز حقوق کو بھول چکی ہے۔ اسے شمع جھنجھوڑتی ہیں۔

> ''ان کا نظریہ تھا کہ مرد کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں، یہ ان کا شرعی حق ہے۔ اگر شوہر بیوی کے اخراجات پورے کرتا ہے تو باہر سیاہ و سفید کچھ بھی کرے آخر وہ مرد ہے، یہ تھے ہمارے گھر کی نیک خواتین کے تاثرات، جو خود بھی گائے بھینس کی طرح کھونٹے سے بندھی صرف پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے پر قناعت کر رہی تھیں۔ ایسی عورتوں اور طوائفوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ انہیں بھی اپنے مردوں سے جذباتی لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ بھی صرف روٹی، کپڑے اور مکان کے لئے تن بیچتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ نت نئے مرد بدلتی ہے اور یہ ایک ہی مرد پہ

اکتفا کرتی ہے۔۔۔۔ یہ ہیں ہمارے سماج کے جیتے جاگتے
شرعی کردار، ایسے سماج کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے بہتر
تھا کہ میں اپنی دنیا الگ بناتی۔ میں نے شوہر کے ساتھ رہنے
سے انکار کر دیا۔'' ۳۱ے

مندرجہ بالا اقتباس میں شمع نے سماج و معاشرہ میں دبی کچلی اور سسکتی ہوئی عورتوں کا ذکر کتنے واضح انداز میں کیا ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے کے بعد ہزاروں سوال پیدا ہوتے ہیں کہ۔ کیا عورت کی ضرورت صرف روٹی کپڑا ہی ہے؟۔ کیا اس کی سماج میں کوئی عزت نہیں؟۔ کیا وہ صرف مرد کا دل بہلانے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟۔ کیا اسے اپنے شوہر کی شفقت، قربت اور رفاقت کی ضرورت نہیں ہے؟۔ ایسے نہ جانے کتنے سوالات اس آپ بیتی کے مطالعے کے بعد ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' عورت ذات کی سچی کہانی ہے۔ اس آپ بیتی کا انتہائی دلچسپ حصہ وہ ہے جو مصنفہ کی ذات سے متعلق ہے۔ یہ حصہ تقریباً نصف کتاب پر محیط ہے۔ باقی حصہ ان واقعات پر مبنی ہے جن کی عینی شاہد خود نفیس بانو شمع ہیں اور بعض اہم واقعات ایسے ہیں جن میں وہ ایک اہم کردار کی حیثیت سے سامنے آتی ہیں۔ اس میں مختلف نسوانی کرداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن سے مصنفہ کی ملاقات کہیں محض حادثاتی اور کہیں واقعاتی ہے۔ شمع نے سماج کے پس منظر میں تلخیوں، عیاریوں اور منافقانہ رویوں پر جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اور سماج و معاشرہ میں دبی کچلی عورتوں کی حالات زندگی کو سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس آپ بیتی کے مطالعے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ محتاجی اور در بدری عورت کا مقدر بن گئی ہے، اور عدم تحفظ کے خوف سے ہی سہی، زندگی بھر سہارے کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہے۔ مگر سب کے سب سہارے کمزور اور کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ ماں، باپ اور خاوند سے لے کر اولاد تک کسی سے تحفظ کی ذمہ داری نہیں ملی۔ مصنفہ کے نزدیک مرد کے سارے نظریات صرف اپنی مطلب براری تک محدود ہیں۔

نفیس بانو شمع کا انداز بیان کہیں کہیں باغیانہ بھی ہو گیا ہے، وہ کہیں ہمت و دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں تو کہیں پسپائی ان کا مقدر ہو جاتا ہے، وہ کہیں اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے پونچھ کر مقابلے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں تو کبھی خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتی ہیں۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ اس کے ذریعے شمع نے اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام

واقعات من وعن قلم بند کر دیا ہے۔

شمع کا بیانیہ اتنا دردناک ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایک خوش طبع انسان بھی اداس ہو جاتا ہے۔اس آپ بیتی کے بیشتر اوراق خود مصنفہ کے ان بے شمار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیں، جو زندگی بھر ان کی آنکھوں کا مقدر رہے۔شمع نے اس آپ بیتی میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ پریشانیوں سے گھبرا کر انہوں نے کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''اس غم کی راہ میں ایک بار پھر ہار گئی۔ایک ساتھ نیند کی کئی گولیاں کھا کر بستر پر خاموشی سے اس لئے لیٹ گئی کہ اب ابدی نیند مل جائے گی اور اضطراب ختم ہو جائے گا،مگر جب تین روز کی مسلسل بے ہوشی کے بعد ہوش آیا تو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ موت پھر مجھ سے کترا کر نکل گئی تھی اور میں اپنے دوزخ کی گہرائیوں میں پھر سے اتر گئی۔'' ۴؎

اس آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شمع نے زندگی کی تلخیوں سے نجات پانے کے لیے دوسرا راستہ تصوف کا اپنایا۔اور وہ گھر چھوڑ دہلی میں عورتوں کے آشرم میں چلی گئیں، جہاں ہر ذات، ہر مذہب اور ہر طبقے کی عورتیں قیام کرتی تھیں۔اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں پناہ ڈھونڈی۔اس کے علاوہ کئی دوسرے بزرگان دین کے پاس حاضری دیتی رہیں اور فیضیاب ہوتی رہیں۔درویشوں سے وابستگی کے دور میں انہوں نے کئی کرامات کا بھی ذکر کیا ہے جن پر کوئی منطقی دماغ شاید ہی یقین کرے،مگر ایک بار قاری سوچنے پر مجبور ضرور ہو جاتا ہے۔

نفیس بانو شمع بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اور ان کے نثر میں بھی شاعری جیسا رنگ ملتا ہے۔خیال آرائی،فکری اسلوب،الفاظ کی بندش،جملوں کی ترکیب اور انداز بیان میں لطافت اور غنائیت اس بات کے ثبوت ہیں۔مثلاً:

> ''آگے چل کر ایک چٹان نما پتھر ملا جس پر صرف سن اور تاریخ لکھی تھی۔اس سے آگے سوالیہ نشان تھا۔میں تھکن سے نڈھال ہو کر اس پتھر پر بیٹھ گئی،اب سوالیہ نشان کی جگہ میں تھی۔'' ۵؎

اس آپ بیتی مین مصنفہ نے شعروں کے حوالے بھی بہت دیئے ہیں۔ہر شعر سچویشن کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے،اور فنی لحاظ سے بھی بلند پایہ ہے۔''دکھ کا چہرہ کون پڑھے؟'' کے عنوان

کے تحت جو مضمون لکھا ہے اس کے آخر میں جو شعر لکھتی ہیں اس سے عورتوں کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

کہیں مسلی ہوئی کلیاں، کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ۔!!٦ے

''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' کا ایک پہلو ایسا ہے جو بطور خاص سب کو متاثر کرتا ہے۔ یہ آپ بیتی بہ ظاہر ایک عورت کی کہہ کر بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ آپ بیتی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے جگ بیتی میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ یعنی مصنفہ کا جو کردار ہے، ہمارے سماج و معاشرے میں نسوانی زندگی کے جتنے بھی کردار ہو سکتے ہیں وہ اس میں سماتے چلے جاتے ہیں اور بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے سماج و معاشرے میں ظاہر ہے عورت کے ذہنی، جذباتی اور روحانی تقاضوں کو جس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے اور جسمانی سطح پر اس کا استحصال ہوتا ہے، ان تمام مسائل کو انہوں نے اتنی سبک اور سلاست کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمیں یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ شعوری طور پر یہ دکھانا چاہتی ہیں کہ مرد نے عورتوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے۔ بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک گذری ہوئی زندگی میں ایک ایسی زندگی جو ہمارے سماج میں عورتوں پر گذر رہی ہے، ہمارے سامنے فلم کے پردے کی طرح اٹھتی چلی جاتی ہے۔ کتاب اتنا دلچسپ ہے کہ اگر ایک دفعہ پڑھنا شروع کر دیں تو پھر جی نہیں چاہتا کہ اسے ہاتھ سے رکھ دیا جائے۔ واقعات و حالات میں کچھ اس طرح کی حقیقتیں بیان ہیں کہ وہ ہمیں پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہیں، اور ہم اسے پڑھتے چلے جاتے ہیں جب تک اسے ختم نہ کر دیں۔

عام طور پر مرد کے اس رویئے کے خلاف اب جو نئی لکھنے والی خواتین آ رہی ہیں ان کے یہاں غم و غصہ بھی ہے، نفرت اور احتجاج کی لے بھی ہے۔ یہ لے افسانے، ناول اور شاعری میں آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ آپ بیتیوں میں بھی یہ لے کہیں کہیں سے آ رہی ہے، چاہے وہ کشور ناہید کی آپ بیتی میں ہو یا امرتا پریتم کے یہاں ہو۔ نفیس بانو شمع کی آپ بیتی میں یہ ساری چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن روحانیت کی طرف جب ان کا جھکاؤ ہوا تو تلخی کچھ کم ہو گئی ہے اور صرف اشاروں کے ذریعے ان تکلیفوں اور مصیبتوں کو بیان کی ہیں جس سے ان کا پورا طبقہ گذر رہا ہے۔

نفیس بانو شمع کا بیانیہ فطری اور حقیقت سے قریب ہے۔ اسلوب سادہ، پر اثر انداز بیان، تحریر صاف، ستھرا اور دلنشیں ہے۔ خارجی اور داخلی کیفیت کا اظہار خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ الفاظ پر گرفت اور ان کو برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس کے ساتھ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک

اسرار ورموز، تصوف کی اصطلاحیں، قرآن وحدیث کے حوالے اور ہر واقعہ کے اختتام پر ایک کاٹ دار جملہ، عیاش مردوں کی بدفعلیوں سے ابھرتی سسکیاں، عورتوں کی کراہیں اور دلگداز چیخیں وغیرہ اس آپ بیتی میں سننے کو ملتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نفیس بانو شمع نے اس آپ بیتی کے ذریعے اپنی زندگی کے درد وکرب کی عکاسی کی ہے۔ یہ آپ بیتی اپنے بے باکی انداز بیان، حق گوئی اور منفرد طرز نگارش کے ساتھ اپنے صفحات پر عورتوں کی بیداری اور حقوق کی بازیابی کا پیغام ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو یہ ایک کامیاب خودنوشت سوانح حیات ہے اور اردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

گردش پا: (۲۰۰۰ء) زبیر رضوی

زبیر رضوی ایک شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں جانے جاتے ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے طویل مدت تک منسلک رہے اور ڈائرکٹر کے عہدے پر پہونچ کر وہاں سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی دہلی سے ایک فعال رکن کی حیثیت سے جڑے رہے، اور گذشتہ دس بارہ سالوں سے ''ذہن جدید'' جیسے رسالے کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے بحیثیت نمائندہ کئی ممالک کا سفر بھی کیا۔ اس کے علاوہ وہ براڈ کاسٹنگ میں ایک اچھے براڈ کاسٹر ثابت ہوئے، جس کا اندازہ اس آپ بیتی کے مطالعے ہوتا ہے۔

''گردش پا'' زبیر رضوی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی کے واقعات وحالات اور یادوں کو ایک کولاج کی طرح بکھیرا اور بٹورا ہے۔ اس آپ بیتی کے ذریعے شاعر کا ماحول، اس کا معاشرہ، تہذیب وتمدن، سماجی ومعاشی حالات، ثقافتی وادبی اور خارجی و معروضی حالات کے تفصیلات کا سراغ ملتا ہے۔ خودنوشت سوانح کے آغاز سے پہلے مصنف نے ابتدائی صفحات پر اپنی نظم ''دھوپ کا سائبان'' کا یہ ٹکڑا جلی حرفوں میں پیش کیا ہے۔

''آؤ
ہم اپنی سوانح لکھیں
اور یہ جانیں
کون کتنا جھوٹ
اور سچ لکھ سکتا ہے
کہ بولا ہوا جھوٹ اور سچ

لکھے ہوئے سے آسان ہے
یا یوں کہو
پردا کھینچ کے کپڑے اتارنا اور بات ہے
اور سب کے سامنے بے لباس ہونا اور بات ہے۔'' ۷۷
(دھوپ کا سائبان)

''گردش پا'' کے مطالعے سے پتہ چلاتا ہے کہ زبیر رضوی کی پیدائش امروہہ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میٹرک کا امتحان حیدرآباد سے پاس کیا۔ گھر کی معاشی حالت اچھی نہ تھی جس کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ بحیثیت ایک معمولی کلرک غیر سرکاری ادارے میں اپنی زندگی کی ابتدا کی۔ چونکہ بچپن ہی میں امروہہ کو خیر باد کہہ دیا تھا اور اپنی خاندانی، تہذیبی، معاشرتی میراث، اس کی آسائش، وہاں کی قصباتی زندگی کو چھوڑ کر اور اپنے امروہوی وجود کو ختم کر کے دہلی جیسے بڑے شہر کا رخ کیا اور فصیل بند شہر میں رہنے لگے۔ اور وہیں رہ کر دہلی جیسے شہر میں قسمت آزمانا شروع کیا۔

اس آپ بیتی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا خاندان کافی مذہبی تھا اور پابندی کے ساتھ روزہ نماز پڑھتے تھے اور سارے ارکان جو اسلام کے ہیں، پورا کرتے تھے، جس کا ذکر اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ ایک جگہ اپنے خاندان کی مذہبی ماحول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میری ماں اور میرے باپ دونوں نے قرآنی آیتوں کا ورد کرتے ہوئے بارش اور آندھی کے زور کو توڑنے کا عمل پڑھا۔ آندھی اور بارش رکی تو ماں مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی اور بہت دیر تک سجدے کی حالت میں ڈوبی رہی۔ ایک چوکی پر بچھا ہوا مصلیٰ اور الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھا ہوا قرآن میری ماں اور میر باپ دونوں کے لئے ہر دکھ اور مصیبت کا علاج تھا۔ ماں کی آواز میں بلا کی کشش تھی۔ قرآن کی تلاوت اور صبح کی اولین ساعتوں میں بارہ ماہ مناجات اور حمد خوانی نے ان کی آواز میں الوہی حلاوت بھر دی تھی۔ انہیں پورا قرآن معہ ترجمے کے حفظ تھا۔ ان کی نمازیں، قرآن خوانی اور ان کا وعظ ساری بستی میں مشہور تھا۔ ان کا دم کیا ہوا پانی، ان

کے تعویذ اور ان کے ہاتھوں زخموں پر مرہم لگوانے، دھوپ اور
گرمی میں دکھ آنے والی آنکھوں میں دواڈلوانا، خاندان اور
محلّہ بھر کی عادت بن چکی تھی۔''۸۷

اس اقتباس سے زبیر رضوی کے خاندان کی تہذیبی و مذہبی ماحول کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اور چونکہ خود ان کا بچپن اور ان کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے ان کی تہذیبی شخصیت کے بارے میں بھی کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

زبیر رضوی نے اس آپ بیتی میں کچھ ایسے کرداروں کا تعارف کرایا ہے، جنہیں وہ لاکھوں، کروڑوں کی بھیڑ کے درمیان رہ کر بھی بھلا نہیں پاتے۔ مثلاً حافظ جی ہوٹل والے، ماں، حکیم عبدالحمید، سنیہہ (SNEH)، نگار سلطانہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دہلی کی کرخنداروں، خراد کی مشینوں اور اس کے سامنے خلیفہ قمر کے سفید منڈے کا ذکر بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف کی خاصیت یہ ہے کہ مشکل سے مشکل کردار کی بیان سازی میں زیادہ الفاظ خرچ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ مختصر الفاظ میں کرداروں کی ساری خوبیاں بیان کر کے رکھ دیتا ہے۔ مثلاً حافظ جی ہوٹل والے کا ذکر یوں کیا ہے:

''ساٹھ سے اوپر کے پیٹھے میں آئے ہوئے سفید ریش ہوٹل
کے مالک حافظ جی پرانے زمانے کی چاوڑی بازار کی رنگین
شاموں اور راتوں میں کھیلے کودے تھے۔ وہ بڑے پیار سے
گاہکوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ سالن کی دیگچیوں پر زور زور سے
کفگیر بجاتے ہوئے وہ گوشت کی لذتوں کا ذکر کرتے کرتے
اچانک ایک لمبی سانس لیتے اور چاوڑی بازار کے کوٹھوں پر
چڑھ جاتے۔ حافظ جی کی شوخ بیانیوں سے بھوک بڑھ
جاتی۔ مقررہ خوراک سے زیادہ جو بھی طلب کیا جاتا اسے حافظ
جی جاتے جاتے کاپی میں نوٹ کروا لیتے۔ اگر دیگچی میں اچھی
بوٹی تلاش کرتی ہوئی کفگیر سے حافظ جی کی نظر ہٹ کر اتفاقاً
سڑک سے گذرتے ہوئے کسی حسین چہرے پر پڑ جاتی تو حافظ
جی پل بھر رک لیے کفگیر دیگچی میں چھوڑ دیتے اور بے ساختہ کہہ
اٹھتے ''سبحان اللہ کیا معشوق ہے'' چہرہ نظروں سے دور ہونے

لگتا تو کفگیر پھر سے دیگچی میں بوٹی ڈھونڈنے لگتی۔'' ۷۹

زبیر رضوی جب بھی فصیل شہر سے باہر قدم نکالتے ہیں تو دہلی کی سڑکوں پر آلودگیوں، شور ہنگاموں کے درمیان بسوں، اسکوٹروں، تانگوں اور رکشوں کے درمیان بھاگتی ہوئی عوامی زندگی سے وہ اپنا رشتہ کبھی نہیں منقطع نہیں کر پاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سارے ناٹک تو اسی فٹ پاتھ پر لکھے جاتے ہیں جہاں پر کئی کردار ان کے شناسا بھی رہے۔ دہلی کی بھاگتی ہوئی عوامی زندگی بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''دہلی کی سڑکوں پر آلودگیوں، شور اور ہنگاموں کے درمیان بسوں، اسکوٹروں، تانگوں اور رکشوں کے درمیان بھاگتی ہوئی عوامی زندگی سے میرا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹا۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں زندگی کے سارے بڑے ناٹک فٹ پاتھ پر ہی کھیلے گئے ہیں۔ ان ناٹکوں کے لافانی کرداروں نے انہی میلے کچیلے فٹ پاتھوں پر جنم لیا ہے۔ زندگی کے لمبے چوڑے فٹ پاتھ پر اسٹیج ہونے والے کچھ ناٹک تو میں نے بھی دیکھے تھے اور اس کے پاتروں سے میری خاصی جان پہچان بھی رہی تھی۔ شاید اسی لیے میرے پاس عوامی زندگی میں رل مل کر حاصل ہونے والے مشاہدے اور تجربے، لکھنے اور بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔'' ۸۰

زبیر رضوی کو اپنے سن بلوغیت کے واقعات بیان کرنے میں خاصہ مہارت حاصل ہے۔ اس لئے انہوں نے دیانتداری اور ایمانداری کے ساتھ سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے اور اس سچائی کو پیش کرنے کے لیے کسی بھی تخلیق کار کے اندر جرأت ہونی چاہیے، اس کے لیے زبیر رضوی کی ہمت کی داد دینی چاہئے کہ انہوں نے سچائی کے ساتھ سب کچھ پیش کر دیا ہے۔ ان واقعات میں چاہے وہ فراق کا ذکر، جوش کا ذکر ہو، آپا جان کے جلتے بدن کی دبی دبی آگ کا ذکر ہو یا تیسری پیاس بجھانے کی معصوم کوشش وغیرہ کا ذکر، انہوں نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب میں جنسیت راہ پا گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس بار بھی اس کا کرتا اور پاجامہ پانی میں پوری طرح بھیگ گیا تھا۔ اور بھیگ کر اس کا بدن بے پردہ ہو گیا تھا میں نے

سہارا دے کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس طرح اٹھایا کہ وہ پل بھر کو مجھ میں پوری طرح سمٹ گئی۔ اس کے چھونے سے میرے کپڑے بھی گیلے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کب سے انار کی طرح پھوٹنے والی ہنسی رکی ہوئی تھی وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ہم دونوں دوسرے ہی پل اندر کے کمرے میں اس تیسری پیاس کو بجھانے کی معصوم کوشش کر رہے تھے۔''۸۱

فراقؔ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہم دونوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور ہمیں اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خالی جام بھرا اور ہم دونو کے 'سراپے' پر للچائی نظر ڈالی، سگریٹ کا دھیڑ سا دھواں منہ سے نکالا۔ پھر کچھ گنگنانے لگے۔ ہمارا اتا پتا پوچھا، بولے ''تم دونوں خوبصورت ہو ہم تمہیں شاعری کرنا سکھائیں گے'' فراق کھڑ ہوئے اور دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ ہی رہے تھے کہ استاد اور محشر رام پوری داخل ہوئے۔''۸۲

جوشؔ کے بارے اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں؛

''ایک صاحب بہلا کے مجھ ایک کمرے میں لے گئے۔ دیکھا تو جوش طلوع ہو رہے تھے۔ مجھے ان کے مقابل بٹھا دیا تھا اور جو لفظ میر کانوں میں پڑے وہ اس طرح تھے۔ ''صاحب زادے خدا نے تمہیں آواز دی ہے جوش صاحب تمہیں کلام دیں گے۔ جب تم اس کمر سے نکلو گے تو یہ تمہیں ہندوستان کا بڑا شاعر بنا چکے ہوں گے۔'' اب وہ صاحب باہر تھے اور دروازہ بند تھا میں جوش کی باہوں کے حصار میں تھا۔ میں رو رہا تھا اور رہائی کی منت کر رہا تھا اتنے میں زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی، جوش سنجیدہ ہو گئے اور بولے ''جاؤ، چلے جاؤ بڑے بد بخت ہو۔''۸۳

اس خودنوشت میں جہاں بہت سی باتوں کو ظاہر کیا گیا ہے وہیں بہت ہی چالاکی سے کچھ باتوں کو چھپایا بھی گیا ہے۔ زبیر رضوی ان معنوں میں بہت خوش قسمت ہیں کہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کی مڈبھیڑ کسی نہ کسی حسین نازنین سے ہوتی رہی ہے۔ انہوں نے بہت صاف گوئی کے ساتھ اپنی داستان سنا دیا ہے۔ ہانگ کانگ، سنگاپور، بے جنگ یا اپنے ملک ہندوستان کا کوئی بھی گوشہ ہو، ان کے نصیب میں حسن و جمال ہی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے بیان میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ سچے واقعے کے لیے موزوں نہیں بلکہ فکشن کے لیے موزوں ہے۔

زبیر رضوی بچپن ہی سے باغیانہ ذہن اور رومانی تیور کے مالک تھے جس کا ذکر اس آپ بیتی میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ بغاوت اور رومانی تیوران کے اندر عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ شاعری سے لگاؤ اور اپنے ترنم کے بنا پر زبیر رضوی مشاعروں کے مقبول ترین شاعر رہے ہیں۔ بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت کامیابی کا ضامن رہی ہے۔ مختلف ادبی شخصیتوں کے انہوں نے چھوٹے چھوٹے خاکے بھی بیان کیے ہیں، اس کے علاوہ دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں اور بہت سی حقائق کے اوپر سے نقاب اٹھایا ہے، اور ایسی رازوں کو ظاہر کیا جس کو ظاہر کرنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی سے متاثر ہوکر ہمدرد کے دفتر میں ٹریڈ یونین بازی کی بھی ابتدا کی اور اس میدان بھی کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔

زبیر رضوی اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ ریڈیو آرٹسٹ، ریڈیو پروگرامر اور آل انڈیا ریڈیو میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے گذارا ہے جہاں پر ساری فن کاری آواز کے ارتعاش پر نمایاں کی جاتی ہے اور یہ کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ مشہور ہستیوں سے رابطے قائم کر کے ان سے انٹرویو لیا اور ریڈیو پر اسے نشر کیا۔ انہوں نے جن لوگوں سے انٹرویو لیا ان میں امیتابھ بچن، ہیما مالنی، شمشاد بیگم اور انور خان وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ انٹرویو کا کچھ حصہ اس کتاب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

''گردش پا'' کو دہلی کی ارتقائی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ دہلی کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی پہلوؤں کا ذکر اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ پرانی دہلی اور خاص کر بلی ماران اپنے پورے تضادات کے ساتھ اس آپ بیتی میں موجود ہے۔ چونکہ زبیر رضوی پرانی دہلی کے بلی ماران علاقے میں رہتے تھے اس لیے اس کتاب میں ایک جگہ وہاں کی سماجی، سیاسی، معاشرتی، ادبی، مذہبی، تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے محلے میں صبح اٹھتے ہی کبوتر اڑانے کی چیخ و پکار، گالی گلوچ، لاؤڈ اسپیکر پر کٹھ ملائیت میں ڈوبا ہوا وعظ، پھیری والوں کی آوازیں، فلمی گانوں کے پرشور ریکارڈ، ہیجڑوں کی آتے جاتے بجتی ہوئی تالیاں، کشتیاں، اکھاڑے، چاندی کے ورق کو کوٹنے کی آوازیں، نکل پالش کی مشینیں، کباڑیوں کی دوکانیں، نیلام میں خریدے ہوئے سامان کے ملبے، پریس اور کارخانوں کی مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ، کالے، سفید برقعوں میں سوداسلف خریدتی بے حجاب عورتیں، پان کی زوردار پیکیں اور سگریٹ کے مرغولے، بڑے کی گوشت کی بد ہئیت نمائش، کٹ پیس، سلمٰی ستارے کی دوکانیں، بڑی بڑی دیگوں میں جگہ جگہ بکتی حلیم، نہاری، بریانی اور قورمہ، پالتو بکرے، مینڈھے، گداگروں کی بھیڑ میں گھرے ہوٹل، دودھ کی ڈیڑیاں، آٹے کی چکی، بہشتی زیور کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کی بڑے پیمانے پر غیر پاکیزہ ماحول میں جز بندی اور جلد سازی اور پھر اس کی بڑے بڑے بنڈلوں میں لاپرواہی سے رکشوں اور گاڑیوں میں گالی گلوچ کے ساتھ لوڈنگ، میلوں، تہواروں پر رات دن کی رونقیں، چہل قدمیاں، زرق برق روزے، نمازیں، تراویح، تنگ تاریک گلیوں میں افیون، چرس کو لاتے جاتے ہاتھ، اسکول، اسکول جاتے لڑکے لڑکیاں، عطر فروش، تیلی، نان بائی، ریت ڈھون والے، گدھوں کے ذریعہ ملبے اٹھانے والے، دودھ، دہی، طاقت واپس لوٹانے والے حکیم، بٹیر، تیتر باز، باورچی، درگاہ کے مجاور، قوالیاں، ہیجڑوں کے ناچ، یہ سارا کچھ اس ایک محلے کا تاریخ و جغرافیہ تھا۔ جہاں میں نے زندگی کے ۲۵ برس گزارے تھے۔'' ۸۴

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت پرانی دہلی کی کیا حالت تھی اور خاص کر مسلمانوں کی۔ آج بھی پرانی دہلی کے بلی ماران علاقے میں مندرجہ بالا اقتباس کے کچھ حالات

دیکھنے کو ملتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبیر رضوی نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور خاص کر اپنے گاؤں کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اور خاص کر دیہاتی علاقوں کی تہذیب وتمدن اور وہاں کون کون سے فصل اگائے جاتے ہیں، اس اقتباس سے اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مندرجہ ذیل اقتباس میں ہندوستان کی تہذیب وتمدن اور یہاں کی ثقافت کو اس آپ بیتی میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس تاریخ میں گنگا تھی ہمالیہ تھا، آم، امرود کے موسم تھے، جوار، باجرہ، مکئی، گنے اور گیہوں کے کھیت تھے، گائے بھینس کا دودھ تھا، شیشم کی چمکتی ہوئی سرخ لکڑی سے بنے رتھ تھے، انہیں گاؤں گاؤں لے کر پھرنے والے سفید بیلوں کی طاقتور جوڑیاں تھیں۔ مٹی کے برتن، چولہے، چھالیاں، سروطے اور پاندان تھے۔ آتش دان اور انگیٹھیوں میں روشن آگ اور دھوپ کی تمازت اور لو سے محفوظ رکھنے والے تہہ خانے، بزرگوں کی قبریں، مزار، عرس اور ہولی کے رنگ، عزاخانے، مجلسیں، مندروں کی گھنٹیاں اور میناروں سے آتی ہوئی اذانیں تھیں۔ ذات پات کے حوالے سے ہونے والے سماجی ٹکراؤ تھے، شادی بیاہ تھے، مراثنیں اور ڈومنیاں تھیں۔ ساون کے جھولے، رت جگے، لوک گیت، گھونگھٹ سے جھانکتی ہوئی اشتیاق بھری آنکھیں، نیم کے پیڑ، چوپالیں، حقے اور کھیتوں، کیاریوں میں ڈورتا ہوا رہٹ کا پانی تھا۔ کھیت کی پگڈنڈیوں پر ناچتے ہوئے مور اور کھیتوں پر حملہ آور ہونے والے ٹڈی دل تھے۔ طوطے تھے۔''۸۵

''گردش پا'' ایک سوانحی تخلیق ہے جو فارم کے اعتبار سے نہ سوانح حیات ہے اور نہ ناول ہے۔ زبیر رضوی نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں جستہ جستہ اور متفرق واقعات اس طرح پروئے گئے ہیں کہ سوانحی تخلیق میں واقعاتی طور پر تسلسل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کتاب میں نہ صرف قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے بلکہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے تجسس بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ سوانحی خاکہ

واقعات کو پیش کرتے ہوئے ایک شعری فضا اور ایک حقیقی منظر نامے کا احساس دلاتا ہے۔اس کتاب میں ایک طرح کا کہانی پن موجود ہے۔

یہ خودنوشت سوانح حیات اس اقتباس کی لاج رکھے ہوئے ہے، جسے زبیر رضوی نے کتاب کے پس ورق پر لکھا ہے۔اس اقتباس سے اس کتاب کو تقویت بھی پہونچتی ہے۔لکھتے ہیں:

''اپنی سوانحی یادیں 'گرش پا' میں رکافی کچھ میں نے رانہی آنکھوں کے ڈر سے رسچ سچ لکھا ہے کہ جن آنکھون نے رآپ کا ماضی دیکھا ہوران کے سامنے زندگی کی بخشش پہ راترانا بے تہوں کو زیب دیتا ہے۔''[۸۶]

اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ترتیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی زمانی ربط و تسلسل ہے۔کیونکہ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی ایک واقعہ جو بہت بعد میں پیش آیا تھا بہت پہلے بیان کر دیا ہے اور کبھی ابتدائی دور کی یادوں کو بہت بعد میں پیش کیا ہے۔اس میں موضوعات کا تنوع ہے۔ذاتی زندگی کے مسائل سے لے کر ادب سیاست، فلم، کھیل کود، ریڈیو، ٹی۔وی، اور بہت سی چیزوں کا اس میں بیان ہے اس کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے اس کتاب جنسیت کا بیان۔کوئی بھی ایسا دور نہیں ہے جس کو پیش کرتے ہوئے زبیر رضوی نے جنسیت کا ذکر نہ کیا ہو، جس کی وجہ اس کتاب میں جنسیت چھائی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس کی زبان بھی افسانوی معلوم ہوتی ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''گردش پا'' ایک اچھی ادبی نثر کا نمونہ ہے۔مصنف کو اپنی بات پوری ادبی ورعنائی کے ساتھ کہنے کا ہنر اور سلیقہ آل انڈیا ریڈیو کی ستائیس (۲۷) سالہ ملازمت سے بھی ملا۔جہاں آدمی کا ذہن اور زبان دونوں گھڑی کی سوئی سے بندھے ہوتے ہیں۔اس میں اسفار کا ذکر بہت زیادہ ہے۔یہ کتاب اپنی سبک روی، مزاج، اسلوب اور تازہ کاری کے لحاظ سے منفرد ہے اور کچھ خامیوں کے باوجود یہ کتاب قابل مطالعہ ہے اور اردو خودنوشت کی سوانحی ادب میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

حواشی

۱: مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، کراچی، ناشر رئیس امروہی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۲
۲: ایضاً، ص ۴۶۰
۳: ایضاً، ص ۲۴۰
۴: ایضاً، ص ۲۲۴
۵: کلیم عاجز، وہ جو شاعری کا سبب ہوا، پٹنہ، بزم کاف، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۶
۶: ایضاً، ص ۶۶، ۶۷
۷: ایضاً، ص ۱۲۷، ۱۲۸
۸: ایضاً، ص ۱۲۹
۹: کلیم عاجز، جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، نئی دہلی، عرشی پبلیکیشنز، انڈیا، ۱۹۸۱ء، ص ہ
۱۰: ایضاً، ص ۶۱
۱۱: ایضاً، ص ۷۶
۱۲: ایضاً، ص ۲۹۴
۱۳: ایضاً، ص ۲۴۷
۱۴: کلیم عاجز، ابھی سن لو مجھ سے، دہلی، سیٹی پرنٹس، ۱۹۹۲ء، ص ۱
۱۵: ایضاً، ص ۱۳
۱۶: ایضاً، ص ۱۱

۲۲:ایضاً،ص۱۰

۲۳:ایضاً،ص۸۴

۲۴:ایضاً،ص۸۰

۲۵:ایضاً،ص۹۵

۲۶:رفعت سروش،اور بستی نہیں یہ دلی ہے،نوئیڈا،نورنگ کتاب گھر،۱۹۹۲ء،ص۷

۲۷:ایضاً،ص۸۵

۲۸:ایضاً،ص۱۰۱

۲۹:ایضاً،ص۲۷۵

۳۰:ایضاً،ص۱۹۰

۳۱:رفعت سروش، پتہ پتہ بوٹا بوٹا،نوئیڈا،نورنگ کتاب گھر،۱۹۹۵ء،ص،۷۔۸

۳۲:ایضاً،ص،۴۲

۳۳:ایضاً،ص،۳۶

۳۴:ایضاً،ص۱۰۴

۳۵:ایضاً،ص۱۱۶

۳۶:کشور ناہید، بری عورت کی کتھا،نئی دہلی،ادیب پبلی کیشنز،۱۹۹۵،ص۵۳

۳۷:ایضاً،ص۲۷

۳۸:ایضاً،ص۱۸،۱۹

۳۹:ایضاً،ص،۲۳

۴۰:ایضاً،ص،۲۶

۴۱:ایضاً،ص،۷۶،۷۷

۴۲:اختر الایمان،اس آباد خرابے میں،دہلی،اردو اکادمی،۱۹۹۶ء،ص۴۴

۴۳:ایضاً،ص،۷۰

۴۴:ایضاً،ص،۱۳۱

۴۵:ایضاً،ص،۱۰۷

۴۶:ایضاً،ص،۱۰۹،۱۱۰

۴۷:ایضاً،ص،۱۰۴

۴۸:ایضاً،ص،۱۱۴

۴۹:ایضاً،ص،۱۸۲

۵۰:ایضاً،ص،۲۲

۵۱:ایضاً،ص،۲۰۸

۵۲:ایضاً،ص،۱۹۸

۵۳:ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی،نئی دہلی،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،۱۹۹۶ء،ص۱۲،۱۳

۵۴:ایضاً،ص،۶۳،۶۴

۵۵:ایضاً،ص،۹۸

۵۶:ایضاً،ص،۱۰۵

۵۷:ایضاً،ص،۲۱۱

۵۸:ایضاً،ص،۳۶۱

۵۹:نفیس بانو شمع، جنت سے نکالی ہوئی حوا، نئی دہلی، آبشار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۳۹، ۴۰

۶۰:ایضاً،ص،۸۸

۶۱:ایضاً،ص،۴۵

۶۲:ایضاً،ص،۱۷۲

۶۳:ایضاً،ص،۶۶

۶۴:ایضاً،ص،۶۴

۶۵:ایضاً،ص،۷۷

۶۶:ایضاً،ص،۲۱۰،۲۱۱

۶۷:ایضاً،ص،۹۶

۶۸:زبیر رضوی، گردش پا، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ۲۰۰۰ء، ص،۶

۶۹:ایضاً،ص،۸

۷۰:ایضاً،ص،۴۵

۷۱:ایضاً،ص،۸۲

۷۲:ایضاً،ص،۳۵

۷۳:ایضاً،ص،۹

۷۴:ایضاً،ص،۱۰

۷۵:ایضاً،ص،۸۶

۷۶:ایضاً،ص،۱۰۱

۷۷:ایضاً، پس ورق

باب سوم

اردو ادبا کی خودنوشت سوانح حیات

شام کی منڈیر سے: (۱۹۸۸ء) وزیر آغا

اردو ادب میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک بلند پایہ ادیب، نقاد اور اپنے عہد کے جدید شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک جفاکش و محنت کش کسان بھی ہیں۔ وہ سرگودھا کے ایک گاؤں میں ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن و جوانی گاؤں کی خوشگوار فضا میں میں بسر کی اور اپنے والد مرحوم و۔ ع۔ خ۔ کے زیر سایہ ادب، تصوف، ویدانت اور تاریخ کا مطالعہ کیا۔ ان کے افکار و خیالات اور ان کی ذہنی نشو و نما میں ان کے والد محترم کی تعلیمات کا خاصہ حصہ ہے۔ ان کے والد ویدانتی شاخ سے تعلق رکھنے والے درویش صفت انسان تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے وہ کمرہ جس میں ان کے والد رہتے تھے خصوصی طور پر محفوظ کر لیا۔

پسند کرتے ہیں۔شہر بھی انہیں پسند ہے مگر شہروں کی پر ہجوم اور مشکل زندگی انہیں پسند نہیں ہے۔اس لیے عام طور پر انہوں نے گاؤں میں زیادہ قیام کیا اور یہیں پر متحرک اور با عمل زندگی گذار رہے ہیں۔

''شام کی منڈیر سے'' وزیر آغا کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ آپ بیتی پچاس (۵۰) سالہ ماضی پر مبنی ہے۔اس کتاب میں وزیر آغا نے اپنے تجربات و مشاہدات،فکری رجحانات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔انھوں نے خودنوشت ۶ سوانح لکھنے کے رویّے کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''اپنی کہانی ہر شخص سنانا چاہتا ہے۔کیوں؟۔شاید اس لیے کہ اپنی تمام تر انکساری کے باوجود ہر شخص خود کو ''مرکز دو عالم'' سمجھتا ہے۔اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کو جھاڑ پونچھ کر اس طور پیش کرے کہ وہ پراسرار یا کرشماتی (Charismatic) نظر آنے لگے۔اس کی کئی صورتیں ہیں۔بعض لوگ جن کی زندگیوں میں سیاست اہم کردار ادا کرتی ہے،اپنی کہانی سناتے ہوئے در پردہ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ تاریخ میں ان کا کیا مقام ہے۔بعض دوسرے اپنے کردار کی اس سختی یا توانائی کو بیان کرتے ہیں جس کے طفیل وہ زمانے سے متصادم ہو کر ذرے سے آفتاب بن گئے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بے باکی اور صاف گوئی کو اپنا مسلک قرار دیتے ہوئے اپنے کردار کی ان پہلوؤں کو منظر عام پر لاتے ہیں جو خلق خدا کی نظروں میں گردن زنی قرار پا سکتے ہیں۔مقصود ان کا بھی اپنی شخصیت ہی کو ابھارنا ہوتا ہے۔گو وہ یہ کام بہ ظاہر اپنی شخصیت کی نفی سے سرانجام دیتے ہیں۔
>
> جب میں نے زیر نظر کتاب لکھنا شروع کی تو میرا مقصود اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا ہرگز نہیں تھا۔مقصود فقط یہ تھا کہ اپنی داستان حیات میں دوسروں کو بھی شریک کروں،جس سے میں خود تو آشنا ہوں لیکن جس سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہیں۔''[1]

وزیر آغا کی داستان شام کی منڈیر سے سنائی جارہی ہے جب سامنے اندھیرا ہوتا ہے اور عقب میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔لیکن یادیں چراغ کی مانند جل رہی ہیں۔وزیر آغا نے یادوں کے چراغ جلا کر زمانہ، زندگی کے حالات وواقعات، تجربات ومشاہدات اور نئی اقدار کے سفر کی داستان سنادی ہے۔اس داستان کو سن کر ہر قاری اپنے دل میں حالات کی سنگینی اور روایت پرستی کو محسوس کرنے لگتا ہے۔بلکہ ایک طرح سے وہ سماجی ومعاشرتی تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیتا ہے اور اس طرح وہ اس عہد کی قدامت پرستی اور روایت پرستی کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

''شام کی منڈیر سے'' وزیر آغا کی ذہنی سفر کے روداد ہے۔لیکن یہ ایک ایسا عنوان ہے جو ابتدا ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اس کا مطالعہ کرتے ہوئے عام قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وزیر آغا اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے دور افق سے شروع ہونے والے ان نقوش کو ڈھوند رہے

ہیں جو ماضی کے گرد میں دب گئے ہیں۔اس آپ بیتی میں مصنف نے قاری سے کچھ نہیں چھپایا اور انہیں حالات وواقعات کو قاری کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اس کی زندگی کو متاثر کیا۔

وزیر آغا کی یادداشت بہت مضبوط ہے، جس کے نتیجے میں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی سے معمولی واقعات وحالات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔انہیں دیہات وشہر دونوں عزیز ہیں، جس کی مثال اس آپ بیتی میں ملتی ہے۔جب وہ دیہات کا ذکر کرتے ہیں تو شہری تہذیب وتمدن اور وہاں کے رہن سہن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

وزیر آغا نے اپنے ماضی کو زندگی کے معنی پہنائے ہیں اور بہت سی حقیقتوں کو کھلے دل سے قبول کیا ہے۔وہ ماضی سے بے تعلق نہیں ہیں، بلکہ ماضی ان کے رگ وریشے میں لہو کی طرح گردش کر رہا ہے۔ماضی ان کی زندگی کی تاریخ ہے اور یہی ان کے جسم وجان کا حصہ ہے۔لیکن جب حال کے دائرہ میں آتے ہیں تو ماضی کو چھوڑتے نہیں بلکہ ادبی کارنامے انجام دینے کے لیے انہوں نے ماضی کو اپنی گرفت میں لے کر 'حال' سے ایک حسین امتزاج پیدا کیا ہے۔اس ضمن میں و۔ع۔خ، سید برادران، مولانا صلاح الدین احمد، شمس آغا، بڑی خالہ اور راجہ مہدی علی خاں ایسے نام ہیں جو وزیر آغا کی ذات کا ایک حصہ ہیں۔وزیر آغا نے انہیں ماضی سے حال میں لا کر انہیں ایک حیات ابدی بخش دی ہے۔وزیر آغا نے و۔ع، خ کے بارے میں، جو ان کے والد اور درویش صفت انسان تھے اور وزیر آغا کی ذہنی نشو ونما میں ان کا بہت ہاتھ تھا، لکھتے ہیں:

''و۔ع۔خ۔کے اپدیشوں نے ہمیں بیک وقت توڑا اور

جوڑا تھا۔ توڑنے کی صورت یہ تھی کہ بچپن سے لے کر جوانی
تک ہم نے کائنات اور زندگی کے بارے میں جو تصورات جمع
کر رکھے تھے وہ ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہو گئے تھے اور
جوڑنے کی صورت یہ تھی کہ ہم ایک بلند تر سطح پر ایک نئے تصور کو
تشکیل دینے میں کامیاب ہونے لگے تھے۔ ہم ایک ہی وقت
میں بے چین اور دکھی بھی تھے اور شانت اور خوش بھی۔ شمس
نے جو فطری طور پر زیادہ حساس اور دور بین تھا، ان اثرات کو
مجھ سے کہیں زیادہ قبول کیا تھا۔''[۲]

''شام کی منڈیر سے'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا نے کبھی بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ابتری اور بدحالی کے زمانے میں بھی انہوں نے اپنی ذات اور شخصیت کو سمیٹ کر رکھا۔ چونکہ وہ زمینی رشتوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے بالکل فطری انداز سے اپنی زندگی، معاشرت اور ادب میں تبدیلی کی بلکہ شعوری طور پر اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کی اور یہی عمل انہوں نے ادب کے معاملے میں بھی روا رکھا۔ ان سے پہلے ادب میں رواج کا اقتدار تھا یا قدامت پرستی کا غلبہ اور اسی دوران ترقی پسند تحریک کا نیا بناؤ سنگار وجود میں آیا جس نے ادب کی ہئیت میں تو اضافہ کیا اور نئے نئے تجربے کیے، لیکن آفاقی نظریئے کے تحت روایت کو اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ چنانچہ ادب معاشرتی اعتبار سے نظریاتی بن گیا تھا جس سے زمین کی بو باس نام کو بھی نہیں تھی۔

وزیر آغا نے اس صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد ادب کو آسمان سے زمین پر اتارا۔ جس کی وجہ سے قدامت پسندوں نے وزیر آغا کو اشتراکی، ترقی پسند اور روایت دشمن کہا۔ وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی تو ہر طرف سے اس کتاب کے خلاف زہر اگلا گیا، کیونکہ اس میں وزیر آغا نے اردو شاعری کو قومی، سیاسی یا معاشی سطح کے بجائے تہذیبی و ثقافتی سطح پر رکھ کر اس کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب نے اردو تنقید کے دھارے کو ایک نئی سمت عطا کی۔ حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے بعد یہ دوسری اہم تنقیدی کتاب ہے۔

وزیر آغا نے اپنی آپ بیتی میں زندگی اور ادب کی توانائیوں کا جائزہ لے کر جب اہل ادب کو بتایا کہ قدامت اور ترقی دونوں اپنی میعاد پوری کر چکے ہیں، لہذا ایک نئے نظام کی ضرورت ہے تو عام قاری جو ادب میں دلچسپی رکھتا ہے ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور وزیر آغا کی یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اس آپ بیتی میں جدیدیت کی سمتیں واضح کرنے کے لیے وزیر آغا نے

مختصر طور پر Delta rhythm,wave Rhythm،Alfa Brain، Mind Space، بے ہیئتی طوفان، Motor force، مسرت، Time، Essence وغیرہ جیسے موضوعات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ بلکہ قدیم وجدید کے قصے میں Old Brain,New Brain, کا ذکر کر کے جدیدیت کی سائنسی بنیاد فراہم کی ہے۔

وزیر آغا نے کبھی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا، لیکن کسی دوست کو سیاست سے منع بھی نہیں کیا۔ اگر چہ وہ خود مسلم لیگی تھے، لیکن دوسری جماعتوں پر کبھی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے بہترین دوستوں میں جن کا ذکر انہوں نے اس آپ بیتی میں کئی جگہ کیا ہے صرف ادیب وشاعر ہی نہیں بلکہ سرگودھا کے بڑے بڑے سیاستداں اور زمیندار تھے۔ ان کا ڈرائیور خود دوسری جماعت کا حمایتی تھا اور ہمیشہ آگے آگے رہتا تھا، مگر وزیر آغا نے کبھی اس کو منع نہیں کیا، اور نہ ہی اس کے بارے میں انہوں نے اس سے کچھ کہا۔

وزیر آغا نے اس کتاب میں تقسیم ملک اور فسادات کے دردناک ماحول کی ایسی حقیقی عکاسی کی ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندوستان پاکستان جنگ کا ذکر بھی اس آپ بیتی میں کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو حالات دونوں ملکوں میں تھے اس کا منظر بے حد دردناک اور جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''پورے پنجاب میں فسادات پوری طرح بھڑک اٹھے، روز حشر کا سا عالم تھا اور یہ روز حشر پورے دو ماہ تک قائم رہا۔ قافلے رواں تھے، لوگ کٹ رہے تھے اور آسمان آنسو بہا رہا تھا''[۳]

آگے لکھتے ہیں:

> ''انسانی بربریت کا ایسا نمونہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا، انسانی جسم کی اس طور بے حرمتی بھی ہوسکتی ہے اس بات کا سان گمان تک نہ تھا۔ مجھے لگا جیسے میں خود دو حصوں میں بٹ گیا ہوں۔ ایک حصہ تو نہر کے کنارے رواں تھا، اور دوسرا نہر کے پانی پر۔ مگر یہ تو ابتدا تھی۔ اس کے بعد ایک ماہ تک تقریباً ہر روز نہر کوئی نہ کوئی بے گور وکفن لاش اٹھائے ہمارے قریب سے گذرتی رہی۔''[۴]

وزیر آغا نے اس آپ بیتی میں سچائی وحقائق کے ساتھ اپنی معاشی مشکلات و مالی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ اس آپ بیتی کا وہ باب جس کا عنوان ''سفر'' ہے ایک ایسے بے ریا اور صاحب دل انسان کا سفر ہے جسے دیہات کی کھلی فضا سے نکل کر شہر کی مشکل اور بے رحم دنیا میں ڈال دیا گیا ہو۔ گاؤں کی طرف واپسی نے ان کو وہ بصیرت عطا کی جس کے ذریعے انہوں نے شہر اور دیہات کے عمرانی مسائل کو علم کی طرح نہیں احساس کی طرح اپنی ذات میں رچا بسا کر اسے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں لاہور کے قیام کے حوالے سے وزیر آغا نے شہری زندگی کا جو دم گھٹنے والا تصویر پیش کیا ہے وہ حقائق پر مبنی ہے۔ چونکہ وہ دیہات کے پروردہ تھے اور انہیں شہر کی مشکل اور مسائل سے بھری زندگی کبھی پسند نہیں رہی، اس لئے وہ شہر سے زیادہ دیہات کی فضا کو پسند کرتے ہیں۔ ایک جگہ لاہور کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

> ''ہر بڑے شہر کی ایک اجتماعی پراسرار آواز ہوتی ہے جو شہر کو جب 'نذر آتش' کرتی ہے تو وہ بھڑکتے ہوئے جذبات کے ساتھ متحرک ہو جاتا ہے۔ پھر جب یہ آواز تھمتی ہے تو وہ بھی رک جاتا ہے۔ لاہور میں رہتے ہوئے جب میں کچھ عرصہ کے لئے اس آواز کے بلاوے پر جاگنے سونے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے میری روح کو قتل کیا جا رہا ہے یا کم از کم اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ یہ احساس صرف مجھے ہی نہیں تھا، از منہ قدیم ہی سے انسان بڑے شہر میں دم گھٹنے کے احساس سے آشنا رہا ہے۔۔۔ لاہور میں رہتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ بحیثیت مجموعی یہ بڑا شہر mind space سے محروم ہو چکا ہے۔ لہذا وہ اپنے اندر کی آواز کا مطیع ہے۔۔۔۔ میں اس آواز کا مطیع نہیں تھا اور اپنے اور اس ربط باہم پر غور کرنے کے قابل تھا ۔اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس احساس ہی نے شہر کے تشدد سے بچایا اور جلد از جلد لاہور کو الوداع کہہ واپس گاؤں جانے کے خواب دیکھنے لگا۔'' ۵

''شام کی منڈیر سے'' میں فطرت کے ساتھ ساتھ تہذیب سے ان کی وابستگی کی کہانی بھی شامل ہے، مثلاً وزیر آغا نے اپنی غربت اور تنگدستی کے تناظر میں شخصیات، ماحول اور ذہنیتوں کا ذکر

بھی کیا ہے۔اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں بہت سی باتیں بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے۔لیکن انہوں نے عشق ومحبت کی داستان کو بہت حد تک چھپا کر پیش کیا ہے۔اس طرح وزیر آغا ایک عام آدمی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وزیر آغا کی خود نوشت سوانح حیات ''شام کی منڈیر سے''اسلوب کی تازگی اوران کی مخصوص انفرادیت کی ایک روشن مثال ہے جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کے واقعات وحالات، تجربات ومشاہدات کا ذکر ملتا ہے۔اس میں انہوں نے اپنی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے نمایاں واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔ان واقعات میں تقسیم ہند اور ۱۹۶۵ء کی ہندوستان و پاکستان کی جنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس عظیم سانحہ کو مصنف نے بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ اپنی ابتدائی تعلیم،اعلیٰ تعلیم،خاندانی حالات،سماجی ومعاشرتی حالات،تہذیبی حالات،کتابوں کی اشاعت جس میں'اردو شاعری کا مزاج''تصورات عشق وخرد اور تخلیقی عمل وغیرہ کے علاوہ مختلف سیمیناروں میں شرکت کی داستان بے حد دلچسپ انداز میں پیش کی ہے۔وہ ہر باب کا آغاز شعر سے کرتے ہیں۔ان کی یہ کتاب خودنوشت سوانح نگاری کی عام ڈگر سے مختلف نظر آتی ہے،اور قاری کو غور وفکر دعوت دیتی ہے۔یہ خودنوشت ایک عام قاری کو ادبی دنیا سے متعارف کراتی ہے۔

ورود مسعود:(۱۹۸۹ء)مسعود حسین خان

ڈاکٹر مسعود حسین خان کی شخصیت بحیثیت مصنف کثیر الجہت ہے۔وہ بیک وقت شاعر،ادیب،نقاد، محقق،سوانح نگار،ماہر دکنیات،ماہر لسانیات اور مشفق استاد کے ساتھ کئی زبانوں کے عالم بھی ہیں۔کم عمری میں ہی ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوگیا تھا۔ان کا شمار اردو کے ان معزز ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات زبان وادب کی آبرو ہیں۔ان کی شرافت اور دیانت داری کے واقعات جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کے ذریعے سنے جاسکتے ہیں۔ان کی تصانیف سے اساتذہ سے لے کر طلبا تک استفادہ کرتے ہیں۔

''ورود مسعود'' کے عنوان سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی خودنوشت سوانح حیات خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل یہ خودنوشت سترہ(۱۷) ابواب میں منقسم ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کو سترہ(۱۷) ادوار میں تقسیم کیا ہے۔مسعود صاحب نے اپنے تجربات ومشاہدات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ آپ بیتی ایک فرد کی زندگی کی داستان تک محدود نہ رہ کر اس پورے عہد کی زندگی کے نشیب وفراز سے

واقف کراتی ہے۔

''ورود مسعود'' میں مصنف نے اپنی پیدائش ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک کے واقعات وحالات کو قلم بند کیا ہے۔ ابتدائی ابواب میں انھوں نے اپنے آبائی وطن، خاندانی وضع وقطع اور اس کی نشاندہی، وہاں کے عوام کی تہذیب وتمدن اور پٹھانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سماجی ومعاشرتی حالات وواقعات اور مقامی بولیوں کی لسانی تشریح بھی ملتی ہے۔ دو ابواب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی یاد میں ہیں، ایک باب مرحوم دلی کالج اور ایک باب میں رنگ بھوم بنگال کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی، کشمیر، تلنگ، انگلینڈ، فرانس اور امریکہ پر ایک ایک باب لکھا ہے اور سب سے زیادہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور وہاں کے احباب کا تذکرہ ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کے قیام کو چھ (۶) حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ علی گڑھ جہاں انھوں نے طالب علمی کا زمانہ گذارا، استاد ہوئے، استادوں اور شاگردوں کے درمیان بیٹھ کر قہقہے لگائے۔ وہاں کے دوستوں نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ علی گڑھ کے زمانے کی بہت سی یادیں اس آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ قابل احترام نام ان کے استاد رشید احمد صدیقی کا ہے۔ انھوں نے رشید صاحب کا ذکر بڑے عزت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔

''ورود مسعود'' کا دوسرا رخ ان حالات وواقعات سے متعلق ہے جو مسعود صاحب کو اپنی تعلیم وملازمت کے سلسلے میں درپیش رہے، اور ان واقعات میں وہ کردار بھی ابھرے ہیں جن کا ذکر انھوں نے کہیں برملا اور کہیں اشاروں میں کیا ہے اور اس تجرباتی زندگی میں ان کے اپنے نظریئے بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی ملازمت کا دور علی گڑھ، حیدرآباد اور دہلی کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد عارضی طور پر کشمیر گئے تھے۔

مسعود صاحب کی ابتدائی زندگی کی یادوں پر قائم گنج چھایا ہوا ہے۔ جس میں میر خاں نظر آتے ہیں جو ایک آزاد خیال اور صاحب ذوق انسان تھے۔ حافظ عطا میاں دکھائی دیتے ہیں، جو فرشتہ خصلت انسان ہیں، حکیم سرور خان سے ملاقات ہوتی ہے جن کی وضع داری مشہور ہے۔ خورشید عالم جو گھروندے بنانے کے کھیل میں خود تو ہمیشہ راج مستری اور مسعود صاحب کو مزدور بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے چہرے یادوں کے افق پر آنے لگتے ہیں۔ مصنف اپنے خاندان کے پس منظر میں اپنے بچپن کی داستان بڑی سادگی اور حقیقت پسندی سے سنائی ہے، جس میں واقعہ نگاری اور کردار نگاری کا رنگ وآہنگ شامل ہے۔ مصنف نے بعض ایسے کرداروں کو بھی پیش کیا ہے جو اپنے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور قصباتی سماج کے آئینہ دار ہیں اور بعض سماج کے منفی

رجحانات کے بھی علم بردار ہیں۔مصنف نے اچھے اور برے دونوں طرح کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔اگر مصنف چاہتا تو قائم گنج کو فرشتوں کا معاشرہ بھی بنا کر پیش کر سکتا تھا،لیکن اس نے سچائی کے ساتھ سارے حقائق کو بیان کیا ہے۔جو خود نوشت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

''ورود مسعود'' میں ڈاکٹر صاحب نے قائم گنج کی یادوں میں وہاں کی زبان کو بہت اہمیت دی ہے،اور اس آپ بیتی میں وہاں کی زبان،محاورے کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اس وقت قائم گنج کے پٹھانوں میں جو زبان وتراکیب رائج تھے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''قائم گنج کا قصبہ قنوجی بولی کے علاقے میں آباد ہے جو راج بھاشا سے بہت ملتی جلتی ہے۔وہاں پونے تین سو برس پہلے پٹھانی خاندان درۂ خیبر سے پشتو بولتے ہوئے آئے تھے۔دو تین پیڑیوں تک پشتو کے اثرات نمایاں رہے خاص کر عورتوں کی بولی میں۔میرے زمانے تک آتے آتے پشتو کے صرف چند لفظ رہ گئے تھے وہ بھی نسوانی محاورے،مثلاً سختن (عشا) پیغلا (کنواری لڑکی) تنبے (کواڑ) پشے (بلی) خوار (خواہر) حریان پیٹی (بدتمیز) مفرد الفاظ اور محاورات کے علاوہ پشتو کے کچھ گیت بھی تھے جو ڈومنیاں (افغانی نسل کی) بچے کی پیدائش یا شادی کی رسموں کے وقت بغیر معنی سمجھے گاتی تھیں۔---اسی طرح سہرے گیت تھے،بچوں کی لوریاں تھیں۔---قائم گنج کے پٹھان گھرانوں میں کھڑی بولی اور اردو بولی جاتی تھی جس میں قدیم اردو کے متروک الفاظ اور تراکیب کثرت سے ملتی تھیں۔''[۲]

''ورود مسعود'' میں یورپ اور ہندوستان کے موقر اداروں کی تہذیبی وادبی تصویروں کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیاسی داؤ پیچ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔مسعود صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بہت دیانت داری وایمانداری کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے۔انھوں نے علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سیاسی داؤ پیچ کو بغیر کسی لاگ لپٹ اور خوف کے ایمانداری کے ساتھ حقیقت بیانی سے کام لیا۔چونکہ یہ دونوں درسگاہیں ان کی مادر علمی ہیں جس کی وجہ سے ان اداروں کا ذکر جب بھی آیا ہے،جذباتی ہو گئے ہیں۔

''ورود مسعود'' میں اردو ادب کی بعض اہم شخصیات کا ذکر نہایت دلچسپ پیرائے میں ملتا ہے۔مثلاً رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کے بارے میں مصنف نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ مصنف خود ان دونوں بزرگوں کے شاگرد اور محرم راز رہ چکے ہیں۔انہوں نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' کی طرح ''موازنۂ رشید و سرور'' مرتب کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کڑھی ہوئی تھی، صدیقی دونوں تھے۔لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔سرور صاحب کی نسبتاً دل تنگ رکھتے ہیں، وہ ابتدا میں جس کو پڑھاتے ہیں، آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے ہیں۔۔۔۔سرور صاحب کے ہاں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔رشید صاحب کا اس اعتبار سے دستر خوان بہت کشادہ تھا۔''[۷]

رشید صاحب اور سرور صاحب شروع میں جتنے ایک دوسرے کے قریب تھے آخر میں اتنے ہی دور ہو گئے۔کیونکہ رشید صاحب اپنی ملازمت میں توسیع چاہتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ان کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی مخالفت کی وجہ سے انہیں توسیع نہیں ملی، اس کے علاوہ اس آپ بیتی کا سب سے سنسنی خیز حصہ وہ ہے جس میں گوپی چند نارنگ کی ایک غلطی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔اس ایک غلطی کی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زبردست ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، جس کی زد میں وہ خود بھی آ گئے۔اس آپ بیتی میں گیان چند جین کا دو یا تین جگہ ذکر آیا ہے، اور ہر جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسعود صاحب گیان چند جین کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں۔انہوں نے گوپی چند نارنگ کو ایک نہایت ذہین اور فعال شخصیت کا مالک کہا ہے اور ان کی کاموں کی تعریف کی ہے۔ایک جگہ گوپی چند نارنگ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نارنگ صاحب ایک نہایت ذہین انسان ہیں، طلاقت لسانی کے ماہر، قلم کار اور فعّال شخصیت کے مالک ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بلوچستان سے ہجرت کر کے واردِ دہلی ہوئے اور یہیں

انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی، بلوچستان میں ان کا ماحول سرتاسر مسلمانوں کا تھا، جس کا اثر تا حال ان کی شخصیت سے جھلکتا ہے۔ انہوں نے آتے ہی جامعہ کے شعبۂ اردو میں جان سی ڈال دی۔ ایسے ایسے سیمینار کرائے کہ باید وشاید، ملک میں ان کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔''۸

مسعود صاحب کو جامعہ سے گہرا لگاؤ تھا کیونکہ ان کا جامعہ سے دوہرا تعلق رہا ہے، پہلی بار ۱۹۳۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں طالب علم کی حیثیت سے آئے اور وہاں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۷۳ء میں بحیثیت وائس چانسلر آئے اور ۱۹۷۸ء تک رہے۔

''ورود مسعود'' میں مسعود صاحب نے مختلف موضوعات پر تفصیل کے ساتھ اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کو انہوں نے ہمیشہ شبہے کی نظر سے دیکھا ہے۔ اردو کے سلسلے میں ان کا رویہ عام طور پر مایوسی کی طرف زیادہ ہے۔ جس کا ذکر آپ بیتی میں جابجا ملتا۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کے نظریات وہی ہیں جو ذاکر صاحب اور سیدین صاحب کے تھے۔ یعنی تعلیم کے ذریعے ''ذہن کے جالوں'' کو صاف کرنا اور ایک وسیع ''عالم انسان دوستی'' کا تصور قائم کرنا ہے۔ اس آپ بیتی میں ادبی ولسانی نکات پر بحث اور ادبی انجمنوں کا تذکرہ انہوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ انہوں نے لسانیات کے بحث کو بھی اٹھایا ہے۔

۱۹۵۵ء میں مسعود صاحب کو ماہرین لسانیات کی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ جس میں بڑے بڑے ماہر لسانیات مثلاً پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر دھیریندر ورما اور پروفیسر سومیاجی وغیرہ نے شرکت کی۔ اس میں لسانیات کو عام کرنے ک لیے منصوبہ بنایا گیا۔ مسعود صاحب ہندوستان میں اردو کی صورت حال پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میری نظر میں ہندوستانی۔۔۔۔ زبانوں کے بارے میں وسیع الخیالی پیدا ہوتی گئی۔ میرے ذہن میں موجود ہندوستان میں اردو کا جو منصب اور مقام ہے وہ بھی واضح ہوتا گیا۔ ہر شخص اپنی مادری زبان کے بارے میں جذباتی رنگ میں سوچتا ہے۔ میں بھی اس سے خالی نہیں تھا۔ خاص طور سے آزادی ملنے کے بعد۔''۹

''ورود مسعود'' میں سینکڑوں افراد کا ذکر ہے۔اشخاص کے قلمی چہرے اوران کے انداز فکرو عمل کے نقوش ملتے ہیں۔مسعود صاحب نے ہر شخص کو اسی انداز میں پیش کیا ہے جس طرح اس کو دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ان کے شخصی خاکوں اور مرقعوں میں ذاتی تجربات کا رنگ گہرا ہے۔ انہوں نے ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے جس نے انہیں منفی یا مثبت طور پر متاثر کیا ہے اور اپنے فکر کے اچھے یا برے نقوش چھوڑ ہیں۔

مسعود صاحب نے اپنی آپ بیتی میں حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔جس شخص کے بارے میں جوانھوں نے رائے قائم کی ہے اس کے برملا اظہار میں انہوں نے کسی قسم کا نہ تکلف کیا ہے اور نہ ہی مداہنت سے کام لیا ہے۔حقیقت نگاری کے اصولوں کا ہر جگہ احترام کیا ہے۔ان کی پیشکش میں جو برہنہ سچائی اور بے ریائی کارفرما ہے وہ مسعود صاحب کے مزاج اور کردار کی بنیادی خصوصیت ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ اس حقیقت بیانی اور سچائی کی وجہ سے ان کے کتنے ہی بزرگ، دوست اور شاگرد کے جذبات لہولہان ہوکر رہ گئے۔

''ورود مسعود'' اردو کی چند بہترین خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو آپ بیتی کے دائرے میں نہ آتی ہوں۔عام خودنوشت سوانح نگاروں کی طرح انہوں نے بھی اپنے موضوع سے انحراف نہیں کیا ہے، اور اپنے تجربات ومشاہدات کے بیان سے کام لیا ہے۔کئی جگہ اپنی شاعری اور علم لسانیات سے کتاب کو گراں بار بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو پائے ہیں۔اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے لیے اپنی شاعری کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور اس میں اکثر جگہ وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں اس کے علاوہ انہوں نے مختلف بہانوں سے اپنی شاعری کو کئی مقامات پر درج کیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔

مسعود صاحب نے اس آپ بیتی کے ذریعے اپنے خاندان، بچپن، ابتدائی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ اور مختلف ممالک کے اسفار مثلاً، نیو یارک، بنگلہ دیش اور یورپ کے علاوہ کشمیر اور دلی کالج وغیرہ کا ذکر الگ الگ باب میں کیا ہے تاکہ خودنوشت میں تسلسل قائم رہے۔اس کتاب میں مصنف کی ذات کے علاوہ دوسرے عوامل زیادہ نظر آتے ہیں۔یونیورسٹی میں لکچرشپ اور پروفیسرشپ کیسے ملتی ہے، صدر کا انتخاب کیسے ہوتا ہے یا پھر یونیورسٹی میں میں لوگ کس طرح ایک دوسرے کے درپے ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ بہت ساری باتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔اکثر و بیشتر یہ خودنوشت اپنے محور سے ہٹ کر

لسانیات وتاریخ کی تہہ میں چلی جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لسانیات یا تاریخ کا کوئی باب پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے اس خودنوشت میں واقعات وحالات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد تاریخ بیان کرنا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسے فقرے ادا کی ہیں جو ان کی شایان شان نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ آپ بیتی علی گڑھ اور دہلی کے یونیورسٹیوں کے حالات پر زیادہ روشنی ڈالتی ہے اور مسعود صاحب کی زندگی کے حالات وواقعات کا احاطہ کم کرتی ہے۔

''ورود مسعود'' ایک دلچسپ خودنوشت ہے، جسے بار بار پڑھا جا سکتا ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کے سفر کو ایک ادیب وشاعر کس وقار کے ساتھ گذارتا ہے اور دیانتداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ہے۔ اس کتاب کی خصوصت یہ ہے کہ مصنف واقعات وحالات کو خوش اسلوبی کے دلکش پیرائے میں بیان کرنے کے فن سے پوری طرح واقف ہے۔ اس کا خوبصورت پیرایۂ بیان قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ورود مسعود'' ایک کامیاب خونوشت سوانح عمری ہے اس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کا تخلیق کار راست گو ہے اور اس نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مصنف نے اپنے مخصوص لب ولہجے کے ساتھ واقعات کو دلکش بنا دیا ہے۔ مصنف کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد کی سوانح عمریوں میں ''ورود مسعود'' کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اور یہ خودنوشت بلاشبہ اردو کی چند بہترین خودنوشت سوانح عمریوں میں شمار کرنے لائق ہے۔

خواب باقی ہیں: (۱۹۹۱ء) آل احمد سرور

''خواب باقی ہیں'' ایک ایسے ادیب، نقاد، عالم اور استاد کی خودنوشت سوانح حیات ہے جس نے شاعری، تنقید، تحقیق، درس وتدریس اور انتظامی امور میں اپنی انفرادیت قائم کرنے کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کام انجام دیے ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی علم حاصل کرنے اور دوسروں کے علم کی پیاس بجھانے میں گذار دی اور ادیبوں اور شاعروں کی کئی نسلوں کی ذہنی تربیت بھی کی ہے۔ انہوں نے صرف کتابوں سے ہی علم حاصل نہیں کیا بلکہ تجربات ومشاہدات کے ذریعے زندگی کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس آپ بیتی میں کئی ملکوں اور شہروں کے سماجی، معاشی، ثقافتی، تہذیبی، سیاسی اور ادبی حالات بیان کیے ہیں۔ یہ حالات مختصر ہیں اور بعض اوقات صرف چند فقروں پر مشتمل ہیں لیکن بصیرت کا بہترین نمونہ ہیں۔

آل احمد سرور نے اپنی علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روداد غیر جذباتی انداز میں ''خواب باقی ہیں'' کے عنوان سے مرتب کی ہے۔ یہ آپ بیتی تقریباً چھ (۶) دہائیوں کے واقعات وحالات پر مشتمل ہے، اور اس عہد کے اہم ادبی مراکز مثلاً علی گڑھ، رام پور اور لکھنؤ وغیرہ کی معاشی صورت حال اور ادبی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے علمی، ادبی، ثقافتی، مذہبی رجحانات اور سیاسی تحریکات کے علاوہ اس سے منسلک حضرات کے اعمال وافکار کا بھی معروضیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی اردو میں شائع ہونے والی آپ بیتیوں کی مبالغہ آرائی اور آرائش سخن سے بڑی حد تک پاک وصاف ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ آپ بیتی اردو کے سوانحی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

سرور صاحب نے اس آپ بیتی کے ذریعے اپنی زندگی کے تمام حالات وواقعات کو بے لاگ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے عبارت آرائی سے بچنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض مقامات پر بیان بالکل سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے اور خود نوشت محض واقعات کا روزنامچہ معلوم ہوتی ہے، جس کا احساس سرور صاحب کو بھی ہے اس لیے وہ حرف آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

> ''بہر حال کوشش یہ ہونی چاہئے کہ لکھنے والا اپنے ساتھ ایمانداری برتے وہ نہ تو یہ کوشش کرے کہ اپنی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے، نہ اپنے آپ کو خلاصۂ کائنات سمجھ کر ہر شخص اور ہر واقعے پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے، نہ اپنا کوئی بت بنا کر پیش کرے تاکہ لوگ اس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے کسی نظریئے کے شکنجے میں، دم بدم بدلتی ہوئی متضاد، رنگا رنگ، حیرت انگیز جلوہ ہائے نو بہ نو سے معمور زندگی کسی اشتہار باز کی سرخیوں سے آلودہ کرے۔''[۱۰]

اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرور صاحب آپ بیتی کے فن کو ایک سنجیدہ اور باوقار ادبی صنف سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن بدایوں سے لے کر ہندوستان کے مختلف شہروں اور بیرون ممالک کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اور ان شہروں کی علمی وادبی فضا کے علاوہ معاشرتی حالات بھی بیان کیے ہیں۔ مصنف نے اپنے خاندان کے ذکر میں نہ تو بے جا تعلّی کا مظاہرہ کیا ہے، اور نہ بے جا انکساری کا۔ اسی طرح اپنے دادا، پردادا اور اولاد کے ذکر میں مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا ہے، اور یہ بتایا

ہے کہ ان کا تعلق بدایوں کے ایک شریف متوسط گھرانے سے ہے۔ سرور صاحب اپنے والد کے ہمراہ یوپی کے مختلف شہروں مثلاً، آگرہ، میرٹھ، غازی پور، پیلی بھیت، الہ آباد، سیتاپور، بجنور، گونڈہ اور علی گڑھ وغیرہ میں رہے اور انہوں نے مختلف اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے بچپن کے بعض دلچسپ اور رنگین واقعات کو بھی انہوں نے پیش کیا ہے جس سے ان کے ذوق جمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

سرور صاحب نے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد آگرہ کالج میں داخلہ لیا۔ انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اپنے کالج کے استادوں کے تذکرے کے علاوہ وہاں کے شاعروں کی روداد بھی بیان کی ہے۔ کالج کی ادبی انجمن اردوئے معلیٰ کے سیکریٹری تھے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا۔ مصنف نے اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اپنی شاعری کے آغاز کا حال بھی لکھا ہے۔ لیکن اس آپ بیتی میں شاعری کا مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ ہاں موقع و محل کے اعتبار سے چند مقامات پر اشعار سے ماضی کی ترجمانی ضرور کی گئی ہے۔

سرور صاحب اردو ادب میں بحیثیت شاعر آئے۔ انہوں نے شاعری دس گیارہ سال کی عمر میں شروع کر دی تھی مگر اس زمانے کی غزلیں اور نظمیں ضائع ہو گئیں۔ اس زمانے میں وہ راشد تخلص کرتے تھے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے قاری کا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ مصنف نے ابتدائی اوراق میں اپنی تعلیمی زندگی کی امتیازی کامرانیوں اور ہنگامی اعزازات کا اظہار برملا اور بلا تامل کیا ہے۔

سرور صاحب نے علی گڑھ میں ایم۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں طلبا یونین کے نائب صدر منتخب ہونے کے ساتھ ساتھ علی گڑھ میگزین کے مدیر بھی ہوئے۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے دور کے ذکر کے ساتھ ساتھ مشاعروں اور مباحثوں کی روداد بھی قلم بند کی ہے۔ انہوں نے اس آپ بیتی اس دور کے اساتذہ میں خواجہ منظور حسین کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اردو سے ایم۔ اے کیا اور شعبۂ اردو میں ان کا تقرر ہو گیا اور اسی زمانے میں ان کی شادی ہو گئی۔

سرور صاحب نے اس کتاب میں ان حضرات کا بھی اجمالاً میں تذکرہ کیا ہے، جس سے ملازمت کے دوران ان کے تعلقات تھے۔ لیکن سر ضیاء الدین کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے، جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس زمانے کی ادبی صورت حال اور یونیورسٹی کی علمی و ادبی فضا پر بھی سرسری انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران اردو کے بعض مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ جن میں مولوی عبدالحق، اصغر

گونڈوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کا نام شامل ہے۔

سرور صاحب کے کیریئر کا آغاز اکتوبر ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔ چونکہ انہیں اردو کا ذوق بچپن سے ہی تھا، اس لیے اردو میں ایم۔اے کیا اور شعبۂ اردو میں استاد مقرر ہو گئے۔ رشید احمد صدیقی کے ریٹائر ہونے کے بعد وہ باقاعدہ طور پر پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہوئے، اور ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ سرور صاحب اپنی آپ بیتی میں اپنے عہد کے بیشتر اہم ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، سیاست دانوں اور استادوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یہ تاثرات مختصر مگر جامع ہیں۔

سرور صاحب نے اپنے عہد کے بعض طلبا و رفقا کے بارے میں مختصراً تذکرہ کیا ہے۔ نورالحسن ہاشمی کے بارے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''نورالحسن ہاشمی انگریزی میں ایم۔اے کر کے آئے تھے۔ بڑی مرتب شخصیت تھی اور مطالعہ بہت اچھا تھا۔ میری نگرانی میں انہوں نے دہلی کے دبستان شاعری پر پی۔ایچ۔ڈی کیا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے اور وہیں پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ تحقیق و تنقید دونوں میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔''[11]

''خواب باقی ہیں'' میں کئی ایسے شاگردوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس وقت کچھ زیادہ مشہور و معروف نہ تھے، اور کچھ ایسے شاگرد بھی تھے جو سرور صاحب سے اپنے رشتۂ تلمذ پر فخر کرتے تھے اور مشہور و معروف بھی تھے مگر ان کا نام تک اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔

''خواب باقی ہیں'' میں لکھنؤ کی علمی و ادبی اور ثقافتی فضا، معاشرتی صورتحال، یونیورسٹی کے علاوہ بعض اہم مراکز مثلاً کافی ہاؤس، دانش محل، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر خاصی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ جس سے ان کی لکھنؤ سے انسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ بحیثیت ریڈر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تقریباً نو (۹) سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں کچھ وجوہات کے بنا پر وہ علی گڑھ چلے آئے مگر وہ لکھنؤ کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر لکھنؤ میں ہم لوگ خوش رہے۔ بہت سے اچھے لوگوں

سے ملنا رہا، تعصب اور تنگ نظری کم نظر آئی۔ لوگوں میں ایک تہذیب اور نفاست دیکھی اور زبان میں ایک خاص لوچ۔ ایک دفعہ بدایوں سے لکھنؤ آ رہا تھا۔ سامان زیادہ تھا، میرا چھوٹا لڑکا ایک بکس پر بیٹھا ہوا تھا۔ سیتا پور میں کوئی صاحب داخل ہوئے، انہوں نے لڑکے کو دیکھا تو کہنے لگے بھیا تم تخت طاؤس پر بیٹھے ہوئے ہو۔ ہمارے گھر کی مہترانی سے برآمدہ صاف کرنے کو کہا، وہاں کوئی ڈبہ رکھا تھا، اس نے کھول کر دیکھا اور کہا، بی بی اس میں دنیا بھر کی نعمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ لکھنؤ اب بہت بدلا ہے۔ مگر اب بھی پرانی وضع ختم نہیں ہوئی ہے۔ پرانا آدمی جاتا ہے تو ضلع جگت سے باز نہیں آتا۔'' ۱۲

اس اقتباس سے سرور صاحب کی لکھنؤ سے انسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے لکھنؤ کے بعض ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس آپ بیتی کے اندر اس عہد کے لکھنؤ کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

''خواب باقی ہیں'' میں سرور صاحب نے اسلام اور قرآنی تعلیم جیسے موضوعات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ سرور صاحب کا خاندان خاصا مذہبی تھا، جس کا ذکر انہوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارے گھر میں خاصا مذہبی ماحول تھا، نماز پابندی سے پڑھنے کی پابندی تھی۔۔۔۔ میں فجر کی نماز قضا پڑھتا تھا یا گول کر جاتا تھا۔ والدرات کو دیر تک مطالعہ کرتے تھے، اس لئے وہ بھی صبح کو دیر سے اٹھتے تھے۔ ہاں روزے سارا گھر پابندی سے رکھتا تھا۔'' ۱۳

''خواب باقی ہیں'' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سرور صاحب علی گڑھ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری بھی رہے اور آفتاب ہال میں بحیثیت پرووسٹ رہے۔ انہوں نے ہنگری، کناڈا، امریکہ، لندن اور پاکستان وغیرہ جیسے ممالک کا سفر کیا۔ امریکہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

''خواب باقی ہیں'' میں سرور صاحب کی زندگی کے کئی ادوار سامنے آتے ہیں ہیں۔ پہلا آگرہ کالج کی طالب علمی کا دور ہے۔ جہاں پر جذبی اور مجاز کے علاوہ میکش اکبرآبادی، فانی، دلگیر اور نیاز فتحپوری وغیرہ جیسے نامور شاعر و ادیب تھے۔ سرور صاحب کالج کی ادبی انجمن کے سیکریٹری تھے، جس کے زیر اہتمام ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا۔ دوسرا دور علی گڑھ کا ہے جہاں سے پہلے انگریزی پھر اردو سے ایم۔اے کیا، اور یہاں کی ادبی اور مجلسی زندگی میں رچ بس گئے اور ایسے بسے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اسٹوڈنٹ یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے اور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اشید احمد صدیقی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ شاعری کی ابتدا کی اور ''سلسبیل'' کے نام سے پہلا مجموعہ کلام بھی یہیں شائع ہوا۔

تیسرے دور میں علی گڑھ سے معتوب ہو کر رام پور پہونچے۔ معتوب ہونے کی وجہ ایک مضمون تھا، جو وائس چانسلر سر ضیاء الدین کے نزدیک قابل اعتراض تھا اور علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا۔ رام پور رضا کالج میں بحیثیت پرنسپل گئے تھے۔ وہاں نواب صاحب کے ایک منظور نظر کو نقل کرتے ہوئے پکڑنے پر معتوب ہوئے اور ڈاکٹر عبدالحق کی معرفت لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت ریڈر تقرر حاصل کیا۔ نو سال ملازمت کرنے کے بعد استعفیٰ دیدیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے، اور آخر تک یہیں رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کئی ملکوں کا سفر کیا اور امریکہ میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ اس کے علاوہ شملہ انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانس ریسرچ میں فیلو رہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودنوشت اردو کی دوسری خودنوشت سوانح عمریوں سے منفرد ہے کیونکہ یہ کتاب بہت حد تک مبالغہ آرائی اور آرائش سخن سے پاک ہے۔ یہ خودنوشت اردو کی بہترین آپ بیتیوں میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

آشرم: (۱۹۹۲ء) شکیل الرحمٰن

''آشرم'' ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات کو اپنے خاندان کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب بتیس (۳۲) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھی خودنوشت سوانح کے لیے ضروری ہیں۔

شکیل الرحمٰن کا تعلق درس وتدریس سے رہا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں شعر و ادب، مصوری اور موسیقی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ جس کا ذکر انہوں نے اس کتاب میں کئی جگہ کیا ہے۔ درس

وتدریس سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔ خاص کر بہار کی سیاست میں ان کا نام قابل ذکر ہے۔ آج بھی وہ سیاست میں سرگرم لیڈر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان اشخاص کا بھی اس کتاب میں ذکر کیا ہے جو ان کے دوست، احباب اور مددگار رہے ہیں، انہوں نے اپنے دوستوں کا ذکر محبت وعقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان اشخاص اور ان تمام کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئے، اور زندگی کے ہر میدان میں اس سے مستفید ہوتے رہے۔

اس آپ بیتی کے مطالعے کے سے شکیل الرحمٰن کے بچپن کی یادوں کے ساتھ ساتھ ان کے خاندانی حالات وواقعات کے علاوہ سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی حالات کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شکیل الرحمٰن کا خاندان خاصا مذہبی واقع ہوا تھا، جس کا ذکر اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''گھر کا ماحول صوفیانہ رہا ہے۔ اس کے والد پھلواری شریف کی خانقاہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ گھر پر عابدوں، بزرگوں اور اللہ والوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا تھا، صوفی شعرا کی کتابیں پڑھی جاتیں، سماع کی محفلیں ہوتیں، جانے کہاں کہاں سے قوال آتے اور حق ومعرفت کے نغمے سناتے، قوال تو اکثر آتے رہتے۔ گھر کے ایسے ماحول کے اثرات قبول کرتا رہا ہے۔۔ ۔۔ بہار شریف اور پھلواری شریف کے کئی اللہ والے، بزرگ صوفیاء ان محفلوں میں آتے، ان کے نورانی چہروں اور صاف بے داغ سفید لباس سے بے حد متاثر ہوتا، قوالوں کے بعض بول سن کر وہ روتے، ان کی ہچکیاں بند ہو جاتیں، جھومتے، حق ہو کے نعرے لگاتے اور بے اختیار کھڑے ہو کر دیوانہ وار گھومتے ہوئے جس شخص کو سینے سے لگا لیتے وہ بھی رقص کرنے لگتا۔ ایسی فضاؤں میں اکثر گم ہو جاتا۔ حمد، نعت اور منقبت سن کر اس کی عجیب حالت ہو جاتی۔''[۳۵]

یہ آپ بیتی بیسویں صدی کی تین دہائیوں کا احاطہ کرتی ہے، اور یہ وہ زمانہ ہے جو ہندوستانی سیاست میں اتھل پتھل کا زمانہ ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب ہندوستانی سیاست میں

بڑی اہمیت کے حامل ہے۔ کیونکہ اسی زمانے میں گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے انگریزوں کو ہندوستان سے کی نکالنے کی تحریک چلائی، مسلم لیگ کی طرف سے مسلمانوں کی جانب سے ایک الگ مملکت کے مطالبے نے زور پکڑا۔ ملک کے دوسب سے بڑے مذہبی فرقوں میں نفرت اور نفاق کا ماحول پیدا ہوگیا۔ یہ وہی دونوں فرقے تھے جو صدیوں سے باہمی رواداری کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ مگر آزادی کے ساتھ ہی ملک دوحصوں میں تقسیم ہوا اور تقسیم شدہ ملک میں دونوں طرف کشت وخون کا ماحول گرم ہوا، ان تمام حالات وواقعات کا ذکر اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ ایک جگہ فسادات کے تعلق سے شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''اس وقت ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو چکے تھے اور پنجاب کے مختلف علاقوں سے دل دہلا دینے والی خبریں آرہی تھیں۔ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں زبردست فساد ہوا تھا اور مسلم لیگ کے ''ڈائرکٹ ایکشن'' کے اعلان کے نتائج سامنے تھے۔ زبردست قتل وغارت ہوئی ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں۔''[۳۶]

مزید لکھتے ہیں:

> ''شرناتھیوں کے قافلے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچنے لگے، لاشوں سے بھری ٹرینیں اسٹیشنوں پر پہنچنے لگیں، خاندان بکھر گئے، لاشوں سے کنویں بھرے نظر آنے لگے، کسی کو کسی پر اعتماد نہ رہا، انسان انسان کا دشمن بن گیا۔''[۳۷]

اس وقت ہندوستانی سیاست اور خاص کر جو بہار کی حالت تھی، جہاں پر فسادات ہو رہے تھے اور ہر طرف کشت وخون کا ماحول تھا، جس کا ذکر اس آپ بیتی میں کربناک اور دردناک انداز میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''بہار میں اچانک فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے، چھپرہ، بہار شریف، گیا، نوادہ سب فسادات کی زد میں آگئے، ٹرینوں میں مسافروں کی لاشیں پہنچ رہی تھیں، شب میں کہیں سے ہر ہر مہادیو اور کہیں سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں آتیں، حکومت جیسے ختم ہوگئی تھی۔ لوگ انتہائی بے دردی سے

ایک دوسرے کا قتل کر رہے تھے، گھر جلا رہے تھے، جلوسوں
میں نعرے لگاتے نکلتے اور کسی محلّے پر حملہ آور ہو جاتے، عورتوں
اور بچوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ ایک قیامت ٹوٹ
پڑی تھی ہر جانب۔'' ۳۸

اس کتاب میں فسادات سے پہلے مصنف نے اپنے شہر چمپارن کی زندگی، وہاں کے حالات وواقعات، سماجی ومعاشرتی صورت حال، تہذیب وتمدن اور وہاں کے ہندو مسلم اتحاد کا منظر خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

''ہولی، دیوالی، دسہرہ، عید اور بقرعید کے تہواروں میں سب
شریک ہوتے، ایک دوسرے کے گھر جاتے، مبارکباد دیتے،
خوب کھاتے پیتے، حویلی میں سب ہولی کھیلتے، دیوالی میں
حویلی کی بچیاں گھروندے بناتیں، رنگاولی سجائی جاتی،۔۔
۔۔۔۔ دیوالی کے دن تمام گھروندوں کو سجایا جاتا، ان پر دیئے
جلائے جاتے، عید بقرعید میں حویلی کے تمام افراد دوسرے
محلّوں میں رہنے والے رشتہ داروں کے ساتھ نماز کے لئے
جاتے، ہندو رشتہ دار آتے اور گھر کے کام میں بڑے انہماک
سے حصہ لیتے۔'' ۳۸

۱۹۴۳ء میں بنگال میں قحط پڑا جس کا اثر صوبۂ بہار پر بھی پڑا اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اس کا ذکر بھی اس آپ بیتی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۳ء میں جب بنگال میں زبردست قحط پڑا تو بہار بھی
گہرے طور پر متاثر ہوا۔ سڑکوں اور گلیوں میں لاغر بچوں کی
بھیڑ نظر آنے لگی، ماؤں کی سوکھی چھاتیوں سے چمٹے کمزور اور
نحیف بچے، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے پیٹ، انتہائی
کمزور ہاتھ پاؤں، ہاتھوں میں بھیک لینے کے لئے پرانے
برتن۔۔۔۔ ایسے جلوس دیکھتا تو لرز اٹھتا۔ کئی صبحیں ایسی
آئیں کہ بعض گلیوں، درختوں اور گھروں کے قریب ان کی
لاشیں ملیں۔'' ۳۹

خودنوشت سوانح حیات کو آگے بڑھانے کے لیے جہاں یادداشت کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے وہیں ڈائری اور نوٹ بک بھی بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ چونکہ شکیل الرحمٰن کو ڈائری اور نوٹ بک لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور اس کا اندازہ آپ بیتی کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈائری اور نوٹ بک سے بہت استفادہ کیا ہے، اور کم وبیش ہر باب میں ڈائری و نوٹ بک کے اقتباسات ملتے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ اپنے ماضی کے بارے میں اپنے تاثرات کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

> ''میرا ماضی ایک آئینہ ہے، ہر آئینہ بہت کچھ کہتا ہے مجھ سے، مجھے ہر آئینے سے محبت ہے، کسی کو توڑنا نہیں چاہتا، کسی کو ٹوٹا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا، ہر آئینہ، ہر شیشہ میری روح، میرے وجود کا حصہ ہے۔'' (یہ باتیں ہماریاں مطبوعہ) ۴۰

اور آگے لکھتے ہیں:

> ''جب میں ماضی کا تصور کرتا ہوں۔۔۔۔ کبھی محسوس ہوتا ہے میرا ماضی قطرۂ خون کی مانند میری پلکوں پر جم گیا ہے اور کبھی محسوس ہوتا ہے، میری زندگی میں جتنے چراغ روشن ہیں سب اسی محفل سے آئے ہیں۔'' (ایضاً) ۴۱

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خودنوشت سوانح حیات کو آگے بڑھانے میں شکیل الرحمٰن صاحب کی لکھی ہوئی ڈائری اور نوٹ بک کافی مددگار ثابت ہوئی ہے۔ یہ ڈائری اور نوٹ بک تاریخی حوالے کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

شکیل الرحمٰن صاحب چونکہ درس وتدریس سے جڑے رہے، بعد میں سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا ذوق وشوق اردو ادب سے کم نہیں ہوا ہے، اور ہمیشہ وہ اردو ادب سے جڑے رہے۔ ان کے ابتدائی زمانے میں ان کے یہاں مشاعرے ہوتے تھے اور خاص طور سے ان کے گھر میں اس کا اہتمام ہوتا تھا اور دور دور سے شعرا آتے تھے، جس کا ذکر اس آپ بیتی میں ملتا ہے، مگر نا کے برابر ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''حویلی میں بڑی رونق رہتی تھی۔ مشاعرے ہوتے رہتے کہ جن میں نئے پرانے شعراء شریک ہوتے۔ دوسرے شہروں یعنی مظفر پور، بیتیا، رکسول وغیرہ سے بھی شعرا آجاتے تھے،

دیکھتے ہی دیکھتے حویلی شہر کی ادبی زندگی کا مرکز بن گئی۔ بھائی جمیل الرحمٰن صاحب بھی شاعری کرنے لگے، مشورۂ سخن عنایت بھائی سے کرتے، دونوں بھائیوں نے اپنی شاعری سے لوگوں کو بے حد متاثر کر رکھا تھا، مشاعروں کے گل دستے بھی شائع ہوئے۔ اس کی ذہنی تربیت میں حویلی اور شہر اور قرب وجوار کے بعض علاقوں میں مشاعروں اور ادبی محفلوں میں جو حصہ لیا فراموش نہیں کر سکتا۔ مشاعروں میں آداب محفل کا خاص خیال رکھا جاتا، ہر ماہ کسی نہ کسی گھر پر مشاعرہ ہوتا اور اردو اور فارسی کے شعراء جمع ہوتے، دیر رات تک محفل جمی رہتی۔''۴۲

''آشرم'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شکیل الرحمٰن صاحب نے واقعات و حالات کو بیان نہیں کیا بلکہ ان تاثرات کے اظہار پر زیادہ زور دیا ہے۔ جس نے ان کی شخصیت کو متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان واقعات وتاثرات کا جن سے ان کا سامنا ہوا اور انہوں نے ان واقعات وحادثات سے ہمیشہ متاثر ہوئے اور فائدہ اٹھایا۔ شکیل الرحمٰن نے عملی اور معروضی انداز میں ان حالات وواقعات اور تاثرات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آپ بیتی شکیل الرحمٰن کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں اس انداز نظر سے پیدا ہونے والے خیالات وحالات اور نظریات کو ایک عام قاری تک پہونچاتی ہے، اور قاری ان حالات وواقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ خودنوشت سوانح عمریاں صیغۂ واحد متکلم میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ''آشرم'' اس سے بالکل منفرد ہے۔ یہ آپ بیتی صیغۂ واحد غائب میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت دوسری آپ بیتیوں سے الگ کرتی ہے۔ آپ بیتی کے درمیان کہیں بوجھل مباحث آگئے ہیں لیکن شکیل الرحمٰن کی طرز تحریر کی دلکشی نے اس بوجھل پن کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ چند خامیوں سے قطع نظر یہ خودنوشت اردو ادب میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

کاغذی ہے پیرہن (۱۹۹۴ء) عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ایک باغی قلم کار کی حیثیت سے اردو ادب میں معروف ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں ان کی

پیدائش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں عورتوں کو ہر لحاظ سے کمتر سمجھا جاتا تھا، اور انہیں مردوں کی غلامی کرنی پڑتی تھی۔ وہ ایک ایسا دور تھا جس میں مرد ذات تعلیم نسواں کے خلاف تھے اور خاص کر مسلمان قوم اس کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہی تھی، لیکن عصمت چغتائی کو اس مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ عصمت چغتائی کے والد سرکاری جج تھے اور تعلیم نسواں کے خلاف نہ ہو کر ہمیشہ تعلیم نسواں کے مہم میں پیش پیش رہے۔ اس وقت علی گڑھ میں عبداللہ خاندان نے تعلیم نسواں کی بنیاد رکھی۔ عصمت نے علی گڑھ سے ایف۔ اے کیا، اور لکھنؤ آئی۔ ٹی کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

مغرب میں تانیثیت (feminist) کی تحریک بعد میں پروان چڑھی۔ عصمت چغتائی بہت پہلے سے ہی عورت کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر چکی تھیں، اگرچہ انہوں نے کبھی بھی اپنے Feminist ہونے کا اعلان نہیں کیا اس کے باوجود وہ اردو کی پہلی Feminist تخلیق کار ہیں، جنھوں نے حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کی اور اس کے لیے کئی افسانے لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ ''بچپن'' سے ان کے نظریئے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے بچوں کو قرآن شریف پڑھانے والے مولوی صاحب کا خاکہ کھینچا ہے۔ یہ افسانہ رسالہ ''تہذیب نسواں'' میں چھپنے کے لیے انھوں نے بھیجا تھا، مگر مدیر نے شائع نہیں کیا۔

عصمت کے افسانوں کے درمیان سے ایک آزاد عورت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے تمام افسانوں، ناولوں اور تخلیقات میں آزاد زندگی کی تلاش میں چہار دیواری کے اندر کراہتی اور بلکتی ہوئی عورتوں کی تصویر ملے گی۔ مثلاً ''ٹیڑھی لکیر'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرہ سے بغاوت کرتی رہتی ہے۔ اس ناول میں شمشاد کے ذریعے مصنفہ نے قدیم رسم و رواج کے فاصلاتی مخالفت کو دکھایا ہے۔ 'شمشاد' اردو ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مشہور افسانہ ''لحاف'' ہے۔ جس میں مذہبی رسم و رواج اور معاشرتی دکھاوے پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ تنقید نگاروں نے اس افسانے کو نمائش اور فحش (Pornography) کا ایک نمونہ قرار دیا ہے۔ اس افسانے پر ۱۹۴۴ء میں لاہور کی عدالت میں مقدمہ بھی چلا اور عدالت اسے فحش ماننے سے انکار کر دیا۔

''کاغذی ہے پیرہن'' عصمت چغتائی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ عام طور سے ایک مکمل خودنوشت میں پیدائش سے لے کر دم تحریر تک کے واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس کتاب میں نہیں ہیں۔ کتاب کا زمانی وقفہ مصنفہ کے گریجویٹ ہونے اور اسکول میں ملازمت کرنے اور لحاف پر مقدمہ کے زمانے تک ہے۔ یعنی صرف چند برسوں پر یہ کتاب مشتمل

ہے۔بچپن کے واقعات ''ٹیڑھی لکیر'' میں شمن (شمشاد) کے کردار کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ اس کتاب میں شامل ایک اور مضمون ''غبار کارواں'' ہے، جس میں بچپن کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

''کاغذی ہے پیرہن'' چودہ (۱۴) ابواب پر مشتمل ہے۔یہ خودنوشت رسالہ ''آج کل'' میں مارچ ۱۹۷۹ء سے مئی ۱۹۸۰ء تک قسط وار شائع ہوتی رہی۔چودہ قسطوں کے بعد مصنفہ اس خودنوشت کو پورا کرنے کا وقت نہیں نکال پائیں۔ہر باب کو ایک الگ عنوان دیا گیا ہے۔سوائے پہلے باب کے تمام ابواب پر عنوانات دیئے گئے ہیں۔دوسرے باب کے ایک بلاک میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔جو اس تصنیف کی نوعیت کو اجاگر کرتی ہے۔مثلاً:

> ''دوسرا باب بھیج رہی ہوں۔میں اپنی یادداشت اور خاندان کے لوگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں کو جنہوں نے مجھے متاثر کیا اور ہر ایک طبقہ کی الجھنوں، نئے سوالوں اور ان کے حل کے مسائل ۔۔۔۔ایک عجیب الجھی ہوئی چیز ہے۔جو چیز جب بھی تیار ہوئے گی بھیجتی رہوں گی۔اسے مختلف عنوان سے چھپنے دیجیئے۔تسلسل ایڈٹ کرتے وقت بعد میں قائم کرلیا جائے گا۔'' [۱۳]

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ان ابواب میں واقعات و حادثات کی ترتیب نہیں ہے۔مصنفہ آپ بیتی پوری کرنے کے بعد اسے شائع کرنا چاہتی تھیں لیکن کچھ وجوہات کے بنا پر یہ ممکن نہ ہوسکا۔

''کاغذی ہے پیرہن'' کا پہلا مضمون جس کا عنوان ''غبار کارواں'' ہے۔قسط وار شائع شدہ مضامین میں نہیں تھا۔اسے پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کی باغی شخصیت کی تعمیر کن حالات کے زیر اثر ہوئی۔اس کا موضوع خاص بچپن ہے۔اس میں انہوں نے بچپن کے حادثات وواقعات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے پڑوسی ہندو تھے، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔لیکن بقرعید اور جنم اشٹمی یا دوسرے تہوار پر آنا جانا بند ہوجاتا تھا اور خاص کر بچوں پر پابندی عائد کردی جاتی تھی، اور دونوں گھروں کے درمیان تہوار کے موقعے پر سارے رشتے ناطے ختم کردیے جاتے تھے۔عصمت کے گھر والے ہندو اور مسلمان میں فرق سمجھاتے تھے، لیکن یہ فرق ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔کیونکہ عصمت ایک آزاد خیال ہندوستانی عورت تھیں، اس لئے

انھوں نے کبھی بھی ہندو مسلم میں فرق نہیں کیا۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

''میں مسلمان ہوں، بت پرستی شرک ہے، میرے دیو مالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ایمان علیحدہ ہے، وطن کی تہذیب علیحدہ ہے۔اس میں میرا برابر کا حصہ ہے۔جیسے اس کی مٹی، دھوپ اور پانی میں میرا حصہ ہے۔میں ہولی پر رنگ کھیلوں، دیوالی پر دیئے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہوجائے گا۔میرا یقین اور شعور کیا اتنا بودا ہے، اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔''[۱۴]

''کاغذی ہے پیرہن'' میں علی گڑھ، لکھنؤ، بریلی اور راجستھانی علاقے کی تہذیبی وسماجی زندگی کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔خاص طور سے راجستھان کے رسم ورواج، جاگیردارانہ ماحول کا نزدیکی معائنہ بہت متاثر کرتا ہے۔بمبئی جانے سے پہلے جودھپور گرلس کالج میں بحیثیت پرنسپل انہوں نے کام کیا۔راجستھان کی یادوں کے بہانے انہوں نے وہاں کی جاگیردارانہ زندگی پر طنز کیا ہے۔محل کے نواب سے لے کر بیویاں تک سونے کے اگالدان میں تھوکتی تھیں، اور نوکرانیاں ہمیشہ اگالدان لے کر تیار رہتی تھیں اور جب تھوکنے کا دل کیا فوراً اگالدان سامنے کردیتی تھیں۔''سونے کا اگالدان'' عنوان کے تحت انہوں نے راجستھان کی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ زندگی کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں جودھپور، سانبھر، سوجت اور جاورا جو راجستھان کے چھوٹے چھوٹے علاقے تھے انہوں نے وہاں کی تہذیبی وسماجی زندگی کو دلچسپ انداز میں بیان کیا۔راجستھان کے سوجت میں ان کے والد جج کی حیثیت سے کچھ دن رہے۔وہاں کی بیواؤں کی زندگی نے انہیں بہت مضطرب کردیا تھا۔سوجت میں بال ودھواؤں کی دوبارہ شادی کا کوئی رواج نہیں تھا۔عام طور پر بیواؤں کا کسی بڑے عہدیدار یا جاگیردار سے تعلق ہوجاتا، اغوا ہوجاتیں یا کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تھیں۔عصمت نے اس وقت کے زمیندارانہ اور جاگیردارانہ تہذیب وتمدن اور رسم ورواج، اس کے کھوکھلے تکلفات اور دکھاوے پر گہرا طنز کیا ہے۔وہاں کے بال ودھواؤں کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ریاست میں رنڈیوں کا کوئی مخصوص کوچہ نہیں تھا۔عموماً بال

ودھوا جب جوان ہو جاتی تھیں تو کسی عہدیدار یا جاگیردار سے
تعلق ہو جاتا تھا۔ جس پر ان کے عہدوں اور دولت کی وجہ سے
انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر یہ برسوں کا
اصول چلا آرہا تھا۔ بستی کی رسم ختم ہونے کے بعد بیوہ کی شادی
کا کوئی سلسلہ نہیں چلا تھا'' ۱۵؎

بیواؤں یا بال ودھواؤں سے جو ناجائز بچے پیدا ہوتے تھے اسے ختم نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ لڑکی ہوتی تو نوکرانی بنا دیا جاتا اور اگر لڑکا ہوتا تو اسے ملٹری کی ٹریننگ کے بعد راج گولا پلٹن میں شامل کر دیا جاتا۔ ان سے جو لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں ان کے بارے میں ایک جگہ عصمت لکھتی ہیں:

''اس قسم کی لڑکیاں بھی محل میں بڑے لاڈ پیار سے پالی جاتی
تھیں اور مہارانی کی ڈاوریاں کہلاتی تھیں، کہنے والے کہتے
تھے، ان کی آپس میں نہ شادی ہو سکتی ہے نہ تعلق، کیونکہ کون
جانے شاید آپس میں ان کا بھائی کا رشتہ ہو۔ راج گولوں اور
ڈاوریوں کی شادی کا کبھی کوئی قصہ نہیں سنا۔ عموماً بیوہ لڑکیاں
اغوا بھی ہوتی تھیں، کسی کے ساتھ بھاگ بھی جاتی تھیں۔ سنا
تھا کراچی میں ان کی بڑی مارکیٹ تھی۔ وہاں کے وڈیرے
جوان تندرست لڑکیاں بڑے شوق سے خریدتے تھے اور وہاں
سے وہ مر کر ہی نکلتی تھیں۔'' ۱۶؎

مندرجہ بالا اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت بیواؤں کی کیا حالت تھی اور راجستھان ہی نہیں بلکہ اس وقت ہر جگہ کا یہی حال تھا۔ اور یہ سب جاگیردارانہ تہذیب وتمدن میں شامل تھا۔

''کاغذی ہے پیرہن'' میں جو کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں، ان کو ہم کبھی بھلا نہیں پاتے۔ ان کرداروں میں عصمت کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی کا کردار ایک قبائلی سردار کی شان رکھتا ہے۔ عصمت کے بچپن کا دوست جگنو ایک اچھے دوست کا کردار ادا کرتا ہے، جو اپنے وعدے کو آخری وقت تک پورا کرتا ہے۔ جگنو کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''مجھے جگنو ہمیشہ بہت پیارے تھے۔ اگر ان سے میری شادی

ہو جاتی تو میں ایک نہایت پتی ورتا بن جاتی۔ مجھے دراز قد مرد
پسند تھے اور وہ گھر میں سب سے اونچے نکلتے تھے۔ آج میں
اپنی کہانیوں کے ہیرو کو پرکھتی ہوں تو انہیں بالکل جگنو پاتی
ہوں۔ جگنو کے دل کا حال میں وثوق سے نہیں بتا سکتی ہوں مگر
میں نے ہمیشہ انہیں اپنا رومانی ہیرو مانا۔'' ۱۷

اس خودنوشت میں عظیم بیگ چغتائی کا کردار بہت اہم ہے۔ عظیم بیگ کے ساتھ ایک خاص معاشرتی حادثہ منسلک ہے جو کہ عصمت کی زندگی میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ عظیم بیگ وہ شخص ہے جو مذہبی شدت پسندوں کے خلاف لڑائی میں ہمیشہ آگے رہے اور انہوں نے نذیر احمد کی کتاب ''امت کی مائیں'' کی مخالفت کرنے والوں کا کھل کر مقابلہ کیا۔ عصمت نے ''دوزخی'' کے نام سے ان کا خاکہ بھی لکھا ہے، جو مقبول ہوا۔

اس خودنوشت سوانح حیات کا سب سے جاندار کردار بچھو پھوپھی کا ہے جو عصمت کی سگی پھوپھی ہیں۔ ''بچھو پھوپھی'' اردو افسانہ کا شہرۂ آفاق کردار ہے۔ مرزا قسیم بیگ چغتائی کی یہ بہن اندر سے اتنی آتش فشاں اور تلخ کیوں تھیں، اس کا جواب افسانہ میں نہیں ملتا مگر اس آپ بیتی میں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ بچھو پھوپھی کی زندگی اور کردار کا ہوش ربا بیان اس آپ بیتی میں ملتا ہے۔ حالات نے ان کے وجود میں کس طرح زہر بھر دیا تھا جو ان کی زبان سے طنز اور طعنہ بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً:

''پھوپھی اماں کی آنکھوں میں پھن ہوتے تو میں کبھی کی نیلی
لاش بن چکی ہوتی۔ صرف ڈھٹائی سے میں نے بڑے بڑے
میدان مارے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے زہریلے ناگ
کھلائے ہیں صرف سنی ان سنی کر کے۔ پھنکارتی سلباتی پھپو
مجھے بھولی سی گڑیا لگ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ کون سا ہتھیار استعمال کرے۔ ''نہیں، بس غارت ہو میری
نظروں کے سامنے سے۔ میرے گھر میں سنپولیوں کی کوئی
گنجائش نہیں۔'' ۱۷

ایک جگہ اور لکھتی ہیں:

''ارے تیری اماں ڈکار گئی میرے پورے خاندان کو، اب یہ
ہڈیاں رہ گئیں ہیں سو تو چچوڑ لے' پھوپھی اماں جب بھی جلی کٹی

پر اتر آتی تھیں تو عجیب لے میں بولنے لگتیں تھیں جیسے مجلس میں
نوحہ خوانی سے پہلے ایک لہراتی ہوئی آواز میں بیان پڑھا جاتا
ہے۔ میں نے بالکل ان کے لہجے کی نقل میں اسی لے سے
کہا۔'' ۱۸

اس آپ بیتی کی آخری قسط ۱۹۸۰ء میں لکھی گئی تھی اور عصمت چغتائی کا انتقال ۱۹۹۲ء میں ہوا، لیکن اس خودنوشت میں عصمت کے ۱۹۸۰ء تک کے حالات وواقعات کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس میں تقریباً دو دہائی پہلے تک کی یادیں ملتی ہیں۔ مصنف نے تاریخ میں بندھ کر یہ آپ بیتی لکھی ہے جس کی وجہ سے اس کے ہر حصے میں افسانے جیسی دلکشی ملتی ہے۔ اس کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔

اس آپ بیتی میں ترقی پسند تحریک اور فلمی دنیا کی جھلکیاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں، جبکہ عصمت دونوں سے بدستور منسلک رہیں۔ عصمت کی شخصیت کو بنانے میں طنز اور ظرافت پسندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عصمت آسان اور سیدھا راستہ اپنانے کے بجائے ہمیشہ ٹیڑھی لکیر کو اپنایا اور اس میں کامیاب بھی رہیں۔ عصمت جب کسی کا خاکہ کھینچتی ہیں تو اس کا پورا عکس آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے بہت ہی خوبصورت خاکے کھینچے ہیں۔ عصمت نے کبھی بھی اپنے آپ کو بلند اور عظیم تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ وہ اپنے خاندان کے ممبروں، اسکول کالج کے دوستوں اور اساتذہ کے درمیان خود اپنا مضحکہ بھی اڑایا اور دوسروں کا مضحکہ بھی اڑایا۔ جس کی مثالیں ''علی گڑھ اور تالے'' کے باب میں بکھرے پڑے ہیں۔

آپ بیتی کا اختتام زمانۂ طالب علمی کی ایک یاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کر چکی ہیں، اور رخصتی کا منظر ہے۔ سینئر لڑکیوں نے جونیئر لڑکیوں کو جلتی ہوئیں قندیلیں سونپیں اس امید کے ساتھ کہ یہ قندیلیں بجھنے نہ پائیں۔ آخری جملے بہت ہی جذباتی ہیں۔

''ان قندیلوں کی روشنی آج تک دل ودماغ میں محفوظ
ہے۔'' ۱۹

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''کاغذی ہے پیرہن'' میں عصمت چغتائی کی شخصیت اور تخلیقی قوت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ترتیب کے فقدان کے باوجود ہم ان کی تخلیقی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ آپ بیتی اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کی روشنی میں عصمت کا جو کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے والی جدید تعلیم یافتہ عورت کا کردار ہے۔ جو مردانہ برتری کی

تعصّبات، عورت کی طرف تنگ نظری، قدیم رسم ورواج، روایت اور توہمات کی ماری ہوئی زندگی کے کسی ایک پہلو سے بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے اس کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا۔ اس آپ بیتی کی روشنی میں ہم عصمت کے کارناموں پر دوبارہ غور کر سکتے ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ نئے طریقے سے لگا سکتے ہیں۔ نامکمل ہونے کے باوجود اردو کی سوانحی ادب میں یہ خودنوشت سوانح ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

گئو دھول: (۱۹۹۵ء) سید محمد عقیل رضوی

''گئو دھول'' پروفیسر سید محمد عقیل صاحب کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ آپ بیتی پینتیس (۳۵) ابواب پر مشتمل ہے۔ اس خودنوشت کے عنوان پر نظر پڑتے ہی قاری کا ذہن ہندوستانی گاؤں کی فضا بالخصوص یوپی کے گاؤں کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا بچپن اسی میں کہیں کھویا ہوا ہے اور مصنف اپنے آپ کو وہاں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ ''گئو دھول'' کی وضاحت کرتے ہوئے عقیل صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''شام کے وقت گاؤں کی طرف واپسی پر چرواہوں کے گلّے کے پیروں سے اڑتی ہوئی دھول، ڈوبتے سورج کی روشنی کو دھندلا دیتی ہے۔ یہی ''گئو دھول'' ہے۔ یہاں اسے ایک طرح سے شام زندگی سمجھ لیجئے۔'' [۲۰]

سید محمد عقیل کی اس خودنوشت کو بہ آسانی ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ وہ ہے جس کا تعلق بچپن سے ہے۔ مصنف کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور گرد و پیش کا ماحول کا تعلق گاؤں اور قصبہ سے ہے اس لیے اس میں جلتے ہوئے کھیت اور پٹتے ہوئے کسان دکھائی دیتے ہیں۔ پورے لوازمات کے ساتھ زمیندارانہ ماحول اور مسلم تہذیب کی ساری کشاکش بھی ہیں، جس کے لیے وہ مشہور ہیں۔ اور اس چکی میں پستا ہوا ایک معصوم بچہ ہے، یتیمی اور بے اعتنائی کا شکار یہ بچہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کس کس طرح شکار ہوتا ہے۔ اس خودنوشت کے ذریعے وہ سارے حقائق سامنے آتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے:

> ''دنیا میں لڑے بھڑے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا اور چاہے زندگی پر جتنی تہذیب کی پرتیں چڑھا دی جائیں مگر بھینس ہمیشہ لاٹھی والے کی ہوگی اور سچ بات یہ ہے کہ زندگی اپنے تمام تجربوں

اور شائستہ فلسفوں کے باوصف اس بنیادی اصول کو نہیں بدل
سکتی۔''[۲۱]

یہ اس بچے کے احساسات ہیں جو دیہات کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلتا ہے، کتے لڑاتا ہے، دن بھر دوستوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے اور پرندوں کا شکار بھی کرتا ہے۔ اس کے کچھ اچھے دوست بھی ہیں جو اس کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں اور اس کا ساتھ دیتے ہیں اور ہر طرح کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات کا بنیادی مطالبہ بقول پروفیسر شمیم حنفی یہ ہوتا ہے کہ اس میں'' مصنف خود کو کسی قدر فاصلے سے دیکھتا ہے'' یہ بہت مشکل اور جان لیوا کام ہے کیونکہ اپنی ذات کے اظہار اور اپنے واقعات وحالات کے بیان میں آپ اپنا مطالعہ خود سے فاصلہ رکھ کر کریں۔ اسی میں کھرے کھوٹے اور حقیقت کی پہچان ہوتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں تخلیق کار بے جا تفاخر اور ظاہر داری جیسی باتوں کے سحر میں شکار ہو کر غیر جانبداری سے مطالعہ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور اپنی تعریف میں زمین وآسمان ایک کر دیتا ہے۔ عقیل صاحب نے ''گئو دھول'' کے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے مذکورہ بالا باتوں سے خود کو بچائے رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''راقم الحروف نے اپنی اس خودنوشت میں ظاہرداری، بے جا
> تفاخر اور ادعائیت سے کہیں کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ پوست کندہ
> حالات لکھ دیئے ہیں۔ اس میں گفتنی بھی ہے اور ناگفتنی
> بھی۔ میں نے کسی کی دل آزاری کی کہیں کوشش نہیں کی
> ہے۔ ہاں جنہوں نے بلا سبب میری دل آزاری کبھی کی ہے
> صرف ان کے واقعات لکھ دیئے ہیں اور بس۔''[۲۲]

عقیل صاحب نے بیشتر جگہوں پر اپنے دعوے کو سچ کر دکھایا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ دعوے حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئے ہوں۔ ''گئو دھول'' کا ابتدائی حصہ جہاں مصنف نے اپنے بچپن کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے، شاید اس خودنوشت کا سب سے زیادہ دلچسپ اور حقائق پر مبنی حصہ ہے۔ قاری اس حصے میں ایک ایسی ذات سے متعارف ہوتا ہے جو اپنے دہقانی مزاج اور آوارگی کے بے انتہا مواقع ہونے کے باوجود اپنی کوشش اور محنت ولگن سے اپنی منزل کو حاصل کرتا ہے۔

''گئو دھول'' میں کچھ ایسے کرداروں کا ذکر بھی ہے، جنہوں نے عقیل صاحب کی ذاتی، تعلیمی

وتدریسی زندگی میں اہم رول ادا کیا ہے، لیکن ان کا ذکر تسلی بخش نہیں ہے۔ ان کرداروں میں صغیر حسن، شیو پرساد پانڈے، جوالا پرساد اور سب سے بڑھ کر بہن کا کردار جس کی دس روپئے کی مدد نے عقیل صاحب کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔

کوئی آپ بیتی محض آپ بیتی نہیں ہوتی بلکہ اپنی اچھی پیش کش اور قاری کی مسلسل شرکت کی وجہ سے جگ بیتی بن جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''گئو دھول'' کا پہلا حصہ (کچھ حصوں کو چھوڑ کر) آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس خودنوشت میں تقسیم ہند کے مناظر، فرقہ وارانہ فسادات اور پھر مصنف کی سیاست اور مذہب سے بیزاری بڑے فطری اور جذباتی ڈھنگ سے سامنے آتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آپ بیتی کا مصنف دیہاتی ہے، شکاری ہے یا ایک عام ہندوستانی۔ ظاہر ہے یہ آپ بیتی ایک عام آدمی کی نہیں بلکہ ایک ممتاز و نامور ادیب و ناقد، پروفیسر اور اسکالر کی خودوشت ہے، اس لیے اگر اس میں علم و ادب نہیں تو تلاش حیات کا سارا عمل بے کار ہے۔

''گئو دھول'' کا دوسرا حصہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جس باب کا عنوان ''نظر نہیں تو کیا نظریہ تو ہے'' ہے۔ دوسرے حصے کا تعلق اگرچہ بچپن اور دیہات سے نہیں ہے لیکن پھر بھی نہ دکھائی دینے والے رشتے اور سلسلے بندھے رہتے ہیں۔ جس کا اعتراف وہ ایک جگہ خود کرتے ہیں:

> ''چونکہ میں دیہات کا پروردہ ہوں اس لیے فکر و نظر میں
> آزاد۔۔۔۔ اگر کوئی غلطی کرتا ہوں تو صدق دل سے تسلیم کرتا
> ہوں۔ میں اقبال کے اس مصرع کا قائل ہوں۔
> کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے''[۲۳]

عقیل صاحب کسی ادیب کے بارے میں اظہار خیال یا دوسروں پر رائے زنی کے معاملے میں اس حد تک کھرے اور سچے انسان ہیں کہ اس کے لیے انہیں نقصانات بھی اٹھانے پڑے ہیں۔ لیکن اپنے خاص عزیزوں، شاگردوں اور دوستوں کے بارے میں وہ بڑے حساس اور محتاط نظر آتے ہیں۔ اس آپ بیتی میں بہن، بھائی، بیوی، بچے اور احباب و شاگرد کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں شاعروں، ادیبوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کے حوالے سے لے کر اردو کے مختلف مراکز، شہروں اور ملکوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس ضمن میں کشمیر، حیدرآباد، دہلی، مدراس، کلکتہ اور بنارس وغیرہ کا ذکر خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ پاکستان اور لندن کا ذکر بھی پرتاثیر ہے۔ اس کے علاوہ اس آپ بیتی میں تاریخ کے اشارے اور تہذیب و تمدن کے جلوے بکھرے

پڑے ہوئے ہیں۔ وہ افراد و مقامات کا مطالعہ بھی اسی پس منظر میں کرتے ہیں اور تہذیب و تمدن اور سیاست و ثقافت کی ایسی کڑیاں ملاتے ہیں کہ کبھی کبھی قاری ان کی علمیت و بصیرت میں ڈوب کر آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کا لطف لینے لگتا ہے۔

عقیل صاحب اس خودنوشت میں اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ چونکہ ان کا تعلق گاؤں سے ہے اس لیے انہوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن، سیاسی و سماجی حالات اور غریب کسانوں پر جاگیرداروں اور زمینداروں کے مظالم کو سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس وقت غریب اور مفلس بچے اپنی زندگی گذارنے کے لیے زمینداروں کی غلامی کرتے تھے، جہاں پر انہیں بہت سی مصیبتوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ہر طرح کے کام ان سے لیا جاتا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''انہیں سخت سے سخت زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا، زمیندار گھرانے کی عورتیں، لڑکیوں کو پالنا زیادہ پسند کرتیں کہ وہ ہر محفل میں ان کے ساتھ لونڈیاں بن کر جاتیں۔۔۔ ۔۔انہیں صاف کپڑے پہننے کی اجازت نہ تھی، انہیں گھر والوں کے بچے ہوئے جوٹھے کھانے میں کھانا ملتا۔۔۔۔ان لونڈی غلاموں کو پلنگ پر سونے کی اجازت نہ تھی، یہ زمین پر بھی سو نہیں سکتے تھے۔ انہیں دیوار کے سہارے ٹک کر جھپکیاں لینے کی اجازت تھی تا کہ رات میں اگر گھر کے کسی فرد کو کسی کام کی ضرورت پڑے تو یہ فوراً جاگ جائیں۔ لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچتیں تو فطرت تو اپنا کام کرتی ہی ہے، تو یہ لڑکیاں زمیندار کے لڑکوں کی تفریح کے کام آتیں اور اگر ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو جھٹ اس کا نکاح کسی غلام سے کر دیا جاتا اور نوزائیدہ خون زمینداری اسی غلام کی اولاد سمجھا جاتا۔''[۲۴]

عقیل صاحب نے اس آپ بیتی میں کئی واقعات ایسے پیش کیے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں، اور اس وقت جاگیردار اور زمیندار غلاموں پر کرتے تھے۔ انہوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنے عہد کی سیاسی و سماجی حالات کو اجاگر کیا ہے اور سیدھے سادے انداز میں میں اپنی بات کو سچائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اس خودنوشت میں انگریزی حکومت کے خلاف کسانوں کی بغاوت اور اس جرم کی سزا

کے طور پر ان کی کھیتوں میں لگائی جانے والی آگ کے شعلے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً:

''ایک شام جب ایدل پور میں کانگریس کا یہ جلوس نکلا ہوا تھا
جس میں گاؤں کے مزدور قسم کے مسلمان اور ہندو شامل تھے تو
یکا یک زمینداروں کے ارہر کے کھیت میں کسی نے آگ
لگادی۔ کھیت سوکھا ہوا تھا، بس بالکل سرو چراغاں بن گیا۔ سارا
گاؤں آگ بجھانے کے لیے ٹوٹ پڑا۔۔۔ اپنے کھیتوں کو
بچانے کی فکر کرنے لگے۔'' ۲۵

''گئو دھول'' کا دوسرا حصہ بے حد قیمتی مشاہدات و واقعات سے پر ہے، لیکن پہلا حصہ جس قدر عملی تجربات اور گرم جذبات سے بھرا ہے، دوسرے حصے میں وہ گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلا حصہ آپ بیتی سے جگ بیتی کی طرف جاتا ہے تو دوسرا حصہ جگ بیتی سے آپ بیتی کی طرف پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں جگ بیتی کی کثرت اور خارجیت کی وجہ سے آپ بیتی کی حدود سے نکل کر یادداشتوں کی حدود میں داخل ہونے لگتی ہے، اس لیے دوسرے حصے میں قاری کو وہ کیفیت حاصل نہیں ہو پاتی جو پہلے حصے میں ہے۔ اور جو آپ بیتی کا فن اور فکر کے اعتبار سے اہم حصہ ہوتا ہے۔

''گئو دھول'' کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ان افراد و مقامات سے عقیل صاحب کو کیا فائدہ ہوا، اور کن ادیبوں اور کتابوں سے متاثر ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ اعجاز صاحب اور احتشام حسین صاحب کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن اس کے بعد بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ قاری کو یہ بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ عقیل صاحب کی اہم کتابیں مثلاً 'نئی علامت نگاری' 'مرثیے کی سماجیات' وغیرہ لکھنے کے عوامل و محرکات کیا تھے۔ حالانکہ وہ ایک نہیں کئی مقامات پر اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کوئی اس خودنوشت سوانح عمری کو بھلا کہے یا برا، پسند کرے یا
ناپسند کرے، مگر یہ تمام بیانات میرا عہد ہیں، میں اس عہد میں
زندہ ہوں اور نہایت والہانہ ڈھنگ سے زندہ ہوں اور میرے
ساتھ تمام بیانات، واقعات اور معاملات اور وقت کے کیف
وکم سب نتھر کر میرے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔۔۔ بڑے
فن کار کا کام ہے کہ تمام رطب و یابس کو چھانٹ کر صرف جوہر

اپنی خودنوشت میں رکھ دے، جو مصنف کو اچھی طرح سے پیش
کر دے اور دنیا کے کام اور تجربے کے لیے کچھ دے جائے
۔۔۔۔اسے بیان کرنے میں کیا حرج ہے۔''[۲۶]

اس میں شک نہیں ہے کہ اس آپ بیتی میں کام اور تجربات کی باتیں بہت ہیں، اس کے علاوہ اس میں اس عہد ہی نہیں بلکہ تہذیب وتمدن، اس وقت کے سماجی، سیاسی حالات وواقعات کے علاوہ اس عہد کے سارے تغیرات وانقلاب بولتے نظر آتے ہیں۔لیکن ایک عام قاری آپ بیتی میں صرف سیاسی وسماجی حالات اور تاریخ وتمدن کا مطالعہ نہیں کرتا ہے بلکہ آپ بیتی میں قاری، مصنف کے بارے میں جاننا چاہتا ہے جو اس آپ بیتی میں کمیاب ہے۔

''گئو دھول'' کا سب سے اہم اور قابل ذکر وصف اس کا اسلوب ہے۔اس کتاب کی نثر بے حد متاثر کرتی ہے اور قاری پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہے۔قاری کو واقعات کی ترتیب کے سہارے اس طرح باندھے رکھتی ہے جیسا کہ ہماری بعض داستانوں کا نثری اسلوب پڑھنے وسننے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔یہ آپ بیتی ہماری تاریخ وتہذیب کی تقریباً چھ(۶) دہائیوں پر محیط ہے۔عقیل صاحب کی تحریر کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔کیونکہ اس کی زبان بول چال کی زبان ہے۔ایک ناقد کی حیثیت سے عقیل صاحب جس زبان کو استعمال کرتے ہیں، گئو دھول کی زبان اس کے مقابلے میں عام فہم اور آسان ہے۔یہ آپ بیتی دوسری آپ بیتیوں کے مقابلے منفرد اور خاص وعام کے لیے قابل توجہ ہے، اور مصنف کی تاریخ اور عہد کے حوالے سے آپ بیتی کی روایت میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

سورش دوراں: (۱۹۹۹ء) حمیدہ سالم

حمیدہ سالم کا تعلق براہ راست اردو ادب سے نہیں ہے، مگر انہوں نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی، اور انہوں نے اس دور کے ادبی مناظر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔اپنی خودنوشت سوانح ''سورش دوراں'' میں انہوں نے اپنی ذات کو مرکز بنانے کے بجائے معاشرے، ماحول اور سماجی تبدیلیوں پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے یہ ایک خاص اور منفرد کتاب بن گئی ہے۔

''سورش دوراں'' ایک فرد کی داستان زندگی نہیں ہے بلکہ یہ انیسویں صدی کے اوائل سے لے کر آخر تک کی ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی اور سماجی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا حصہ جس کا تعلق ہندوستان سے ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں مصنفہ نے غیر ممالک میں اپنے تجربات وتاثرات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے۔

پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے، جس میں حمیدہ سالم نے اپنے بچپن کی یادوں، نوجوانی کے تجربات اور تعلیم وغیرہ کے مسائل پر روشنی ڈالی ہیں، اس کے علاوہ خاندانی حالات وشخصیات، ملازمت اور شادی شدہ زندگی کے تجربات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلا باب سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مصنفہ نے ''باتیں بیتے دنوں کی'' عنوان کے تحت ردولی کے قصباتی ماحول، گھریلو زندگی، تہذیبی پس منظر، رسم ورواج، عرس، تہواروں وغیرہ کی تصویر کشی بہت خوبصورت اور موثر انداز میں کیا۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ نظام کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہیں۔ ردولی کی جاگیردارانہ نظام کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''قصبہ ردولی کی بیشتر آبادی زمینداروں پر مشتمل تھی۔ کھیت اور باغات اس کے اردگرد قدرے فاصلے پر تھے۔ ان زمینداروں کا کاشتکاروں سے تعلق صرف لگان کی وصولی تک محدود تھا ۔۔۔۔۔ کتنا عجیب لگتا ہے یہ خیال کہ زمین خدا کی دی ہوئی نعمت چند لوگوں کی ملکیت میں آجائے، اور اس کی اگلی ہوئی دولت سے ایک محدود حلقہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرے۔ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو اور وہ محنت کش کسان جو دن رات ایک کر کے عیش وآرام کے یہ ذرائع فراہم کرتا ہے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھی بمشکل بھر پائے۔'' ۲۷

ردولی کی رسم ورواج اور قصباتی ماحول کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ردولی کی زندگی میں جہاں ہم سب بھائی بہن پیدا ہوئے اور جو ہمارا وطن تھا بڑی نفاست تھی، بڑا سلیقہ تھا، بڑی چمک دمک تھی۔ تقریبیں اور تیوتہوار جس شان وشوکت سے منائے جاتے تھے اس کا جواب نہیں۔ شادی بیاہ کی تقریبوں کے علاوہ لڑکوں کی بسم اللہ، روزہ کشائی، لڑکیوں کے نک چھیدن، کن چھیدن سب ہی حسب حیثیت بڑی آن بان سے منائے جاتے تھے۔'' ۲۸

تعلیم کے سلسلے میں حمیدہ سالم کا تعلق عبداللہ گرلز اسکول علی گڑھ، آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ اور

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رہا۔ جس کا ذکر انہوں نے دوسرے باب میں کیا ہے۔ علی گڑھ میں ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ انہوں نے ان اداروں کی خصوصیات اور ماحول کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے اور خاص کر علی گڑھ گرلز اسکول کا ذکر کافی دلچسپ ہے۔ اپنی تعلیم کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''میری باضابطہ تعلیم کی ابتدا علی گڑھ ہی آ کر ہوئی، اس سلسلے کو دو قسطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور اسکول کا سن بتیس سے سن اڑتیس کا، دوسرا یونیورسٹی کا سن بیالیس سے پینتالیس کا۔ بیچ کے چار سال میں نے لکھنؤ آئی۔ ٹی کالج میں گذارے۔''[۲۹]

حمیدہ سالم نے ''ان مٹ نقوش'' کے عنوان سے اپنے خاندانی حالات اور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، جو سب سے زیادہ اہم ہے، اور خاص کر وہ حصہ جس میں انہوں نے اپنے بھائی اسرار الحق مجاز کا ذکر کیا ہے۔ مجاز کے المیہ کو انہوں نے بے حد شدت سے محسوس کیا جس کی وجہ سے ان کا بیان ابتدا سے آخر تک جذباتی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مجاز کی طبیعت کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اسرار بھائی بچپن سے شوخ و شریر اور ذہین تھے۔ کھیل کود میں آگے، ادھم بازی میں ممتاز، شرارت اور شوخی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت بھی تھی، ساتھ ہی ساتھ لاابالی پن بھی۔۔۔۔ زمیندارانہ ماحول میں جو اونچ نیچ کا ماحول تھا اس سے وہ بالکل بے نیاز تھے گھر کے کام کرنے والے لڑکوں کے ساتھ ان کا گہرا یارانہ تھا۔۔۔۔ ہر تفریح سے دلچسپی، ہر کھیل میں ماہر، کسے معلوم تھا زندگی کے سب سے اہم کھیل میں جہاں دل کی بازی لگتی ہے ایسی مات کھائیں گے، ایسی چوٹ کھائیں گے کہ چکنا چور ہو کر رہ جائیں گے۔''[۳۰]

''آنچل اور پرچم کا ملاپ'' کے عنوان سے انہوں نے اگلے باب میں کئی موضوعات کو پیش کیا ہے۔ جس میں انہوں نے کرامت حسین کالج کی ملازمت کے دوران اپنے تجربات و مشاہدات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ شادی شدہ زندگی، سسرال کے خاندان کا تذکرہ کے علاوہ اپنے شوہر پروفیسر ابو سالم صاحب کی شخصیت کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آخر میں اپنے شوہر کے

دہلی میں قیام اور ملازمت کا ذکر ہے اور پھر خرطوم کی روانگی پر پہلا حصہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

دوسرے حصے میں ہندوستان سے باہر مختلف ممالک میں ان کے قیام اور تجربات کا ذکر ہے، جن میں خرطوم اور یوتھوپیا کا ذکر خاص طور سے دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ خرطوم کی مختصر تاریخ، سماجی اور سیاسی حالات، جغرافیائی خصوصیات، رسم ورواج اور معاشی حالات کا حمیدہ سالم نے خاصی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور مہاجروں کی زندگی اور ان کی موجودگی سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو کافی دلچسپ ہے۔ ایک جگہ خرطوم کی تاریخ یوں بیان کرتی ہیں:

> ''خرطوم سوڈان کا دارالسلطنت ہے۔ شہر کی حیثیت سے خاصا غیر دلچسپ، تاریخ بھی بہت پرانی نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں ملک کا دارالخلافہ بنا اور دو دفعہ اجڑا اور پھر سے آباد ہوا۔ پہلی دفعہ گورڈن اور مہدی کے درمیان جنگ کے دوران اور دوسری دفعہ جب کچر نے مہدی کو شکست دے کر برطانیہ کا جھنڈا لہرایا۔ یہ شہر دریائے نیل پر آباد ہے اور دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پرانا حصہ جو دریائے نیل کی دوسری طرف ہے عمدرالمان کہلاتا ہے۔ یہاں مہدی کا مقبرہ اور ایک چھوٹا سا میوزیم ہے۔''[۳۱]

یوتھوپیا کا ذکر بھی انہوں نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہاں کی مائی تھولوجی، تاریخ، عصری حالات اور شہنشاہیت کے خاتمے کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔ اس کے علاوہ حمیدہ سالم نے امریکہ، یورپ اور عرب ممالک کی سیاحت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی واقفیت ان ملکوں سے سرسری ہے اور ان کا رویہ ایک عام ٹورسٹ کا ہے۔

آپ بیتی کا آخری باب حمیدہ سالم کے پندرہ سال بعد ہندوستان واپسی سے متعلق ہے۔ اس باب میں انھوں نے زیادہ تر پریشانیوں کا ذکر کیا ہے، جو بڑے شہروں میں ایک عام شہری کو پیش آتی ہیں اور جنہیں خوشحال لوگ زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حمیدہ سالم نے اس آپ بیتی میں گاہے بہ گاہے سماجی صورت حال پر روشنی ڈالی ہیں اور کہیں کہیں اقدار کی پامالی اور لوگوں کی بے حسی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ دوسر ممالک کے بارے میں ان کے تاثرات زیادہ روشن اور دلچسپ ہیں لیکن ہندوستان کے تناظر میں ان کی فکر اور ہمدردیوں کا دائرہ کافی محدود ہے۔ ''سورش دوراں'' چند خامیوں کے باوجود کئی اعتبار

سے اہمیت کے حامل ہے، اور اردو کی اہم خودنوشت سوانح عمریوں شمار کرنے کے لائق ہے۔

میں کیا میری حیات کیا: (۲۰۰۳ء) اطہر صدیقی

اطہر صدیقی کا تعلق براہ راست اردو ادب سے نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق ماہر طفیلیات (Parasitology) سے ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر اور سائنسدان کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے اپنے میدان میں کامیابی و کامرانی کے جھنڈے تو گاڑے ہی، ساتھ ہی ساتھ سائنسی موضوعات پر نئے زاویہ ہائے نظر سے بین الاقوامی سائنسی منظرنامے پر اپنی الگ اور منفرد مقام بھی حاصل کیے۔

اطہر صدیقی کی پیدائش ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء سہارن پور میں ہوئی۔ پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے اور پھر اسکول سے فراغت کے بعد ۱۹۴۷ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ معاشی حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد بحیثیت سائنس استاد، مراد آباد مسلم انٹر کالج میں اسّی (۸۰) روپئے ماہوار سے اپنی ملازمت کی ابتدا کی۔ جب کچھ معاشی حالات اچھے ہوئے تو ۱۹۵۱ء میں دوبارہ علی گڑھ واپسی ہوئی اور ایم۔ ایس۔ سی 'زوالوجی' میں داخلہ لیا۔ ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد استاد کی مدد سے بحیثیت لکچرر مقرر ہوئے۔ اسی درمیان پی۔ ایچ۔ ڈی میں بھی داخلہ لے لیا جس کا موضوع ''طفیلیات'' (parasitology) تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے۔ اس طرح اطہر صدیقی جولائی ۱۹۵۳ء سے دسمبر ۱۹۹۱ء تک یونیورسٹی سے منسلک رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

''میں کیا میری حیات کیا'' اطہر صدیقی کی خودنوشت سوانح حیات ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں انہوں نے اپنی نجی اور ذاتی زندگی کے حوالے سے مختلف اشخاص، مقامات، اداروں اور تہذیبوں کو پیش کیا ہے، جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں سفرنامے، علی گڑھ کے بعض وائس چانسلروں کے خاکے اور کچھ اہم اور یادگار خطوط کا ذکر کیا ہے۔ جو اس خودنوشت کا ایک اہم حصہ ہے۔ کتاب کے ابتدا میں اردو کے مشہور و معروف ناول نگار قاضی عبدالستار کی تقریظ ''سرآغاز'' کے عنوان سے شامل ہے۔ قاضی صاحب اس خودنوشت کو ایک ممتاز آپ بیتی کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''امتیازات کی نشاندہی کے بغیر ممتاز کا لفظ بے معنی اور بے آبرو ہے۔''[۳۲]

قاضی صاحب نے اطہر صدیقی کی خودنوشت کی انفرادیت اور امتیازات کی مدلل نشاندہی کی

ہے۔انہوں نے اس کتاب کو خود پرستی اور خودستائی سے پاک بتایا ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''اطہر صدیقی کے پاس خود پرستی اور خودستائی کے ڈھیروں مواقع تھے لیکن وہ اس پل صراط سے اس طرح کامران گذر گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔''[۳۳]

''میں کیا میری حیات کیا'' کی پہلی جلد مختلف ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کا تعین کسی مخصوص پہلو کی نشاندہی پر مبنی ہے۔اگر ایک باب میں اپنے بچپن اور ابتدائی زمانے کی صورت حال کا احاطہ کیا ہے تو دوسرے باب میں طالب علمی کے زمانے کے نشیب وفراز اور جدوجہد کا ذکر ملتا ہے۔اس کے علاوہ تقسیم ملک اور فسادات کے اس دردناک ماحول کی عکاسی ایسے کی گئی کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔سہارن پور میں کس طرح ہندو مسلم میں فسادات ہوئے اس کا حال ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''کسی نے یہ خبر اڑادی کہ جلوس پر کسی نے گوشت کا ایک لوتھڑا پھینک دیا،اور بس یہی خبر سہارن پور میں ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلمان جھگڑوں کی بنیاد بن گئی۔۔۔یہ خبر آگ کی طرح شہر کے علاقوں میں پھیل گئی کہ ہندو مسلم فساد ہوگیا۔''[۳۴]

اطہر صدیقی نے اپنی ملازمت اور اس سلسلے میں جو مسائل پیش آئے اسے بھی بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں غیر ممالک کے دوروں اور ان سے متعلق علمی اور تہذیبی صورت حال کا جائزہ لیا ہے۔امریکہ کے بعض چشم کشا باتیں کہیں ہیں۔امریکی سماج اور سیاست کے متنوع پہلوؤں کا جو انہوں نے اظہار کیا ہے وہ اہم بھی ہیں اور جامع بھی۔یہ سچ ہے کہ امریکی طرز معاشرت میں خرابیاں بھی ہیں،مگر خرابیوں سے زیادہ ان کی اچھائیاں ہیں،اور خرابیاں کہاں نہیں ہوتی ہے۔امریکیوں کے یہاں انسانی رشتوں کا بڑا احترام ہے ان کے اندر وہ ساری خوبیاں ونشانیاں موجود ہیں جو ایک زندہ اور خوش اخلاق قوموں میں ہوتی ہیں،اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ امریکی قوم محنت کی عظمت سے آگاہ ہے اور یہی ان کی ترقی کا راز بھی ہے۔ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے۔

> ''امریکہ میں ایک بات جو سب سے اچھی ہے وہ ہے Dignity of labour کام کرنے کی عزت،عظمت یا جو بھی آپ کہہ لیں۔وہاں کسی کو کوئی کام کرنے میں عار نہیں ہوتا۔کیبل خود جب بیریا کالج،کینٹکی میں انڈر گریجویٹ

طالب علم تھا تو پارٹ ٹائم ایک بیکری میں کام کرتا تھا، جب
پرڈیو میں وہ پروفیسر تھا تو اس کے بیٹے لافی یت کے گھروں
میں اخبار بانٹا کرتے تھے، غرض اس طرح کے کاموں کو کوئی
معیوب نہیں سمجھتا۔ ذرا تصور کیجیے علی گڑھ میں کسی پروفیسر کا بیٹا
اپنے علاقے میں اخبار سپلائی کرتا ہو تو لوگ کیا
کہیں گے۔''۳۵

یہ وہ محنت کا تصور ہے جو اسلام نے دیا ہے اور امریکی قوم نے اس تصور کو اپنی زندگی کا ایک حصہ بنالیا۔ جس کی وجہ سے آج وہ ترقی یافتہ اور خوش حال ہیں۔ اطہر صدیقی نے امریکی سماج کے بر عکس امریکی سیاست کے نہایت کریہہ اور گھناونے چہرے کو بھی پیش کیا ہے۔ امریکی سیاست دوغلے پن، دوہرے معیار اور تضادات کی شکار ہے۔ انہوں نے ایم آئی ٹی کے مشہور پروفیسر نوام چوسکی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: ''امریکہ خود دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ملک ہے اور دنیا بھر میں دہشت گردی پھیلاتا رہتا ہے۔''۳۶

اطہر صدیقی نے اس آپ بیتی میں علی گڑھ اور بیرونی ممالک کی بعض درس گاہوں کی تعلیمی اور انتظامی زندگی کا تقابلی موازنہ کیا ہے، اس کے علاوہ درس وتدریس کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ پہلے حصے میں کئی ابواب ہیں اور ہر باب کا تعین کسی مخصوص پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کی ابواب سازی اپنے آپ میں مصنف کی ذہنی ضابطہ بندی کی نمائندگی کرتی ہے۔

''میں کیا میری حیات کیا'' کا گیارہواں باب خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس باب میں انہوں نے اپنی بیگم، ہمدم، دوست ذکیہ صدیقی کے تعلق سے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس باب کو دل کی روشنائی سے لکھا ہے، اور اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، جس سے اکثر شوہر گریزاں رہتے ہیں اور بہت کم شوہر ایسے ہوتے ہیں جو حقیقت کا اعتراف کرنے کی اپنے اندر ہمت اور جرأت رکھتے ہیں۔ لیکن اطہر صدیقی نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''پرانے زمانے میں بیویوں کی پہچان شوہروں سے ہوتی
تھی۔ اپنی پروفیشنل زندگی میں انہوں نے اس قدر کامیابی
حاصل کرلی ہے کہ اب وہ میری پہچان بن گئی ہیں۔ ظاہر ہے نو
سال تک چار پانچ ہزار لڑکیوں کے والدین اور اس شہر میں

لوگ ان کو اتنا جان گئے ہیں کہ اب بھی کسی محفل میں لوگ ان کو
زیادہ پہچانتے ہیں اور مجھے تقریباً نہیں، اب میں ان کے
واسطے سے متعارف ہوتا ہوں۔ فون پر ازراہ تعارف پوچھتے
ہیں وہ کہ اطہر کون ہے، تو میں بتلاتا ہوں کی میں عبداللہ کالج
کی جو پرنسپل تھیں ان کا شوہر بول رہا ہوں اور لوگ فوراً پہچان
جاتے ہیں، یہی حال اپنے گھر کا پتہ بتانے کا ہے۔ کوئی
استفسار کرتا ہے تو کہتا ہوں کہ کسی سے بھی عبداللہ کالج کی
پرنسپل کا گھر پوچھ لیجئے آسانی سے پتہ مل جائے گا۔ غالب کے
ایک شعر کے مصرعۂ ثانی کو تحریف سے پڑھ لیجئے
تیرے پتے سے خلق کو اب میرا گھر ملے۔'' ۳۷

اطہر صدیقی کی نجی زندگی اور ذاتی مراسم اور خاندانی منظر نامے میں ایسے بیشتر اساتذہ ،مصنف ،اعزہ واقارب کا ذکر آیا ہے جن سے علی گڑھ مقامی طور پر خاصی واقفیت رکھتا ہے۔ ایسے تذکروں میں مصنف کی پسند وناپسند اور بنتے بگڑتے مراسم کی ایک تاریخ بھی مرتب ہوگئی ہے اور اس کے آئینے میں بہت سے ممتاز اور نیک نام لوگوں کے چہرے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور مصنف خود بھی اپنے مزاج اور افتادطبع کے ساتھ پوری طرح رونما نظر آتا ہے۔

اطہر صدیقی سائنس داں ہونے کے باوجود اردو شعروادب کا بالیدہ ذوق رکھتے ہیں جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں دیکھ سکتے ہیں، انہوں نے اشعار کا خوبصورت انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ اطہر صدیقی کے سائنسی ذہن میں ایک شاعر کا دھڑکتا ہوا دل بھی ہے جس کا اندازہ اس آپ بیتی کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

اطہر صدیقی کی خودنوشت کی دوسری جلد مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ جس میں خاکے، سفرنامے اور خطوط شامل ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ہی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو ''آپا جی'' کا خاکہ ہے۔ اس کے علاوہ بابر مرزا کی پوری شخصیت، مطالعے کے بعد سامنے آجاتی ہے۔ اس میں یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کے کرداروں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ حقائق اور سچائی پر مبنی ہے۔ اس آپ بیتی میں شامل سفرنامے سیدھے سادے انداز بیان کے لیے یاد رکھے جائیں گے۔

اطہر صدیقی کو اپنے اظہار پر قدرت حاصل ہے، جس کی بدولت وہ مشکل سے مشکل بات کو نہایت سلاست اور فصاحت کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ الفاظ ان

کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے۔ یہ آپ بیتی داخلی اور خارجی منظر نامے کا ایک بہترین کتاب ہے اور اطہر صدقی نے یقینی طور پر اس میں اپنی حیات کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے کرداروں کو زندہ و جاوید کر دیا ہے جو وقت کے گرد میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔

اطہر صدیقی کا خاندان تقسیم ہند کے المیئے سے شدید طور پر دوچار رہا جس کے نتیجے میں انہوں نے تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے احساس، مہاجرت اور شخصیات کے دو ٹکروں میں بٹ جانے کا تجربہ کیا ہے۔ جس کا ثبوت ان سفرناموں میں تفصیل سے ملتے ہیں جو انہوں نے اپنے اعزہ سے ملاقات کی غرض سے کئے۔ انہوں نے خانگی زندگی کے کرب کے ساتھ ساتھ جسمانی ، مادی، جذباتی اور روحانی ہجرت کے تجربے کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

''میں کیا میری حیات کیا'' کی زبان اور اسلوب بیان اردو کی اہم اور نمائندہ آپ بیتیوں میں ممتاز اور منفرد حیثیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں ان کی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کو بدرجۂ اتم سامنے آنے کا موقع ملا ہے۔ اس آپ بیتی میں اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ ان کا نہایت متوازن اور فکری رویہ ملتا ہے۔ زرخیز ذہن اور زبان پر ماہرانہ گرفت اس کتاب کے وہ بنیادی عناصر ہیں جو شروع سے آخر تک یادوں اور خیالات کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور قاری مسلسل مصنف کے تخلیقی عمل میں ایک شریک کار کی حیثیت حاصل کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

حواشی

۱: وزیر آغا، شام کی منڈیر سے، دہلی، سیمانت پرکاشن، ۱۹۸۶ء، ص ۷، ۸
۲: ایضاً، ص، ۵۸
۳: ایضاً، ص، ۷۵
۴: ایضاً، ص، ۷۴
۵: ایضاً، ص، ۲۰۹، ۲۱۰
۶: مسعود حسین خان، ورود مسعود، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۹ء، ص ۲۸
۷: ایضاً، ص ۸۴
۸: ایضاً، ص، ۲۲۸
۹: ایضاً، ص، ۱۶۳
۱۰: آل احمد سرور، خواب باقی ہیں، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۱ء، ص، ۷، ۸
۱۱: ایضاً، ص، ۱۰۳
۱۲: ایضاً، ص، ۱۶۳، ۱۶۴
۱۳: ایضا، ۲۷
۱۴: شکیل الرحمٰن، آشرم، دہلی، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص ۸۰، ۸۱
۱۵: ایضاً، ص ۱۵۷
۱۶: ایضاً، ص ۱۶۰

۲۲: ایضاً،ص،۱۹
۲۳: عصمت چغتائی، کاغذی ہے پیرہن، نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن،۱۹۹۴ء،ص۸
۲۴: ایضاً،ص،۳۵
۲۵: ایضاً،ص،۱۷۴
۲۶: ایضاً،ص،۱۷۴،۱۷۵
۲۷: ایضاً،ص،۱۱۷
۲۸: ایضاً،ص،۹۰
۲۹: ایضاً،ص،۹۵
۳۰: ایضاً،ص،۲۸۸
۳۱: سید محمد عقیل رضوی، گئو دھول، الہ آباد، انجمن تہذیب نو،۱۹۹۵ء،ص۷
۳۲: ایضاً،ص،۴۲
۳۳: ایضاً،ص،۷
۳۴: ایضاً،ص،۲۳۷
۳۵: ایضاً،ص،۳۷
۳۶: ایضاً،ص،۲۵
۳۷: ایضاً،ص،۲۷۹
۳۸: حمیدہ سالم، سورش دوراں، دہلی، ایچ۔ایس۔ پرنٹنگ پریس،۱۹۹۹ء،ص،۲۳
۳۹: ایضاً،ص،۲۷
۴۰: ایضاً،ص،۵۱
۴۱: ایضاً،ص،۹۲،۹۳
۴۲: ایضاً،ص،۲۰۷،۲۰۸
۴۳: اطہر صدیقی، میں کیا میری حیات کیا، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۳ء،ص۱
۴۴: ایضاً،ص،۲
۴۵: ایضاً،ص،۵۴
۴۶: ایضاً،ص،۱۲۸
۴۷: ایضاً،ص،۱۵۴
۴۸: ایضاً،ص،۲۸۵

حاصل مطالعہ

کہتے ہیں کہ زندہ قومیں اپنی تاریخ خود بناتی ہیں، لیکن یہ حقیقت صرف کسی زندہ قوم تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ ایک مصور رنگ اور برش کے ذریعے صفحات پر تصویریں اتارتا ہے تو اس کی مصوری اگر مائیکل انجیلو کے نام سے موسوم ہو تو اپنی تاریخ خود بناتی ہے۔ اسی طرح موسیقی، رقص، سنگ تراشی، شاعری یا ادب کے ذریعے حقیقت سامنے آتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات لکھنے کا رواج تو صدیوں سے رہا ہے اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ متعدد اکابرین، محققین، دانشوران، سیاستداں، مفکرین، مذہبی رہنما اور مؤرخین نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا ہے، جس کے مطالعے قاری کو نہ صرف تخلیق کار کی زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے بلکہ اس عہد کی تاریخ، تہذیب و تمدن، سماج و معاشرہ، رسم و رواج، عادات و اطوار اور روش و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری کی جھلکیاں ویسے تو ویدوں کے عہد سے لکھی جانے والی کتابوں میں ملنے لگتی ہیں لیکن ہندوستان میں خودنوشت سوانح لکھنے کا رواج مسلم حکمرانوں کے دور میں شروع ہوا۔ امیر تیمور کے ملفوظات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ 'تزک بابری' اور 'تزک جہانگیری' سے خودنوشت سوانح عمری کا وجود تحریری شکل میں دیکھنے کو ملنے لگتا ہے۔ شیخ علی حزیں نے اپنی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سوانحی واقعات کو اپنی خودنوشت کا حصہ

بنایا ہے۔مندرجہ بالا خودنوشت سوانح عمریاں فارسی زبان میں ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے اس صنف کی ترقی میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

اردو میں سب سے پہلی خودنوشت سوانح عمری جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' (کالا پانی) ہے، جس میں خودنوشت کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔یہ خودنوشت انگریزوں کے ظلم وستم اور وہابی تحریک کی داستان ہے۔ظہیر دہلوی کی خودنوشت ''داستان غدر'' ہے، جو ۱۸۵۷ء کے واقعات اور حادثات کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔خواجہ حسن نظامی نے بھی خودنوشت تحریر کی جس کو انہوں نے ''عرفان ہستی کا بہی کھاتہ'' کا عنوان دیا۔یہ خودنوشت خواجہ حسن نظامی کی تحریری صلاحیت کو بخوبی واضح کرتی ہے۔دیوان سنگھ مفتون نے ''ناقابل فراموش'' کے نام سے خودنوشت سوانح عمری ترتیب دی جس میں زبان کی سلاست اور تاریخ کی صداقت واضح طور پر نظر آتی ہے۔۱۹۴۲ء میں سب سے مقبول ومعروف خودنوشت سوانح سر رضا علی نے ''اعمال نامہ'' تحریر کی جو انگریزی خودنوشت کی طرز پر لکھی گئی ہے۔یہ اپنی نوعیت کی واحد خودنوشت سوانح ہے جس میں موصوف نے ملک کے سیاسی حالات، ادبی تنازعات اور علمی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر اعجاز حسین نے ''میری دنیا'' کے نام سے اپنی خودنوشت قلم بند کی، جس میں الٰہ آباد یونیورسٹی اور وہاں کی سیاسی زندگی، تعلیمی معیار، تہذیبی اور ثقافتی فضا کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔۱۹۷۰ء میں جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی بارات'' کے نام سے خودنوشت تحریر کر کے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا۔''آشفتہ بیانی میری'' رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی ہے، جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور وہاں کی ادبی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت ''مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں'' میں تعلیمی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔علاوہ ازیں ۱۹۸۰ء کے پہلے بہت سی خودنوشت سوانح عمریاں تحریر کی گئیں، لیکن مقالے کے حدود کے پیش نظر ان کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں۔

اس طرح خودنوشت سوانح لکھنے کا رواج زور پکڑتا رہا اور یکے بعد دیگرے کئی اہم خودنوشت سوانح عمریاں منظر عام پر آئیں۔۱۹۸۰ء کے بعد جو اہم خودنوشت سوانح عمریاں ادبی افق پر نمودار ہوئیں ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، عقیل احمد، مسعود حسین خان، آل احمد سرور، کشور ناہید، اختر الایمان، عصمت چغتائی، رفعت سروش، وزیر آغا، کلیم عاجز، ادا جعفری اور زبیر رضوی وغیرہ کی خودنوشت سوانح عمریاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱۹۸۳ء میں مہندر سنگھ بیدی سحر کی خودنوشت سوانح ''یادوں کا جشن'' منظر عام پر آئی۔اس خودنوشت کا وصف اس کی مجلسی اور ادبی فضا ہے، اور اس لحاظ سے یہ سوانح عمری بہت کامیاب ٹھہرتی

ہے۔۱۹۸۱ء میں ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' اور ۱۹۹۲ء میں ''ابھی سن لو مجھ سے'' کلیم عاجز کی دو خودنوشت سوانح عمریاں شائع ہوئیں۔اگر چہ ان میں فسادات کے بے جا ذکر سے طبیعت کسی قدر مکدر ہو جاتی ہے، لیکن سوانحی واقعات کے لیے اس کی زبان نہایت موزوں ومناسب ہے۔رفعت سروش کی خودنوشت سوانح عمریاں ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' (۱۹۸۶ء)، ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' (۱۹۹۲ء) اور ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' (۱۹۹۵ء) میں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ان آپ بیتیوں میں سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ خوشگوار یادوں کی روشنی، احساسات وجذبات کے جھونکوں کی خوشبو اور پورے عہد کا جھلمل منظر نامہ ملتا ہے۔رفعت سروش کی خودنوشت سوانح عمریوں میں دو تین نسلیں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ان میں بمبئی، دہلی اور موانہ کے حالات وواقعات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔وزیر آغا کی خودنوشت سوانح ''شام کی منڈیر سے'' کے اسلوب کی تازگی اور لب ولہجے کی وجہ سے بے حد پسند کی جاتی ہے۔جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کے واقعات وحالات اور تجربات ومشاہدات کا ذکر ملتا ہے۔''ورود مسعود'' (۱۹۸۸ء) مسعود حسین خان کی خودنوشت سوانح عمری ہے، جس کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کا تخلیق کار راست گو ہے اس کتاب میں علی گڑھ اور دہلی کی ادبی، تہذیبی، سماجی اور معاشرتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔آل احمد سرور کی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔یہ خودنوشت بہت حد تک مبالغہ آرائی اور آرائش سخن سے پاک ہے۔''آشرم'' شکیل الرحمٰن کی خودنوشت سوانح ہے، جو ایک استاد ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی ہیں۔اس کی سب بڑی خصوصیت جو اسے دوسری آپ بیتیوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ صیغۂ واحد غائب میں بیان کی گئی ہے۔عام طور پر خودنوشت سوانح عمریاں صیغۂ واحد متکلم میں لکھی جاتی ہیں۔''بری عورت کی کتھا'' میں کشور ناہید نے ہمارے سماج ومعاشرے میں عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی ہے، ان تمام حالات کا ذکر سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کیا ہے۔اختر الایمان نے اپنی خودنوشت سوانح ''اس آباد خرابے میں'' کے ذریعے زندگی کے تجربات ومشاہدات کو بڑی سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس میں زندگی کے معمولی وغیر معمولی دونوں طرح کے واقعات ملتے ہیں۔''کاغذی ہے پیرہن'' کے ذریعے عصمت چغتائی کی شخصیت اور تخلیقی قوت ابھر کر سامنے آتی ہے۔یہ خودنوشت نامکمل اور ترتیب کے فقدان کے باوجود اردو خودنوشت سوانح میں اہمیت کے قابل ہے۔''گئو دھول'' (سید عقیل رضوی) کا سب سے اہم وصف اس کا اسلوب بیان ہے۔اس کتاب کی رواں اور واقعات کا دلچسپ بیان بے حد متاثر کرتے ہیں۔ادا جعفری کی خودنوشت سوانح ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اپنے انداز فکر، انداز نگارش

اور انداز پیش کش ہر اعتبار سے دلکش ہے۔اس کی نثر میں تمام شعری وسائل سے کام لیا گیا ہے۔''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' میں نفیس بانو شمع نے اپنی زندگی کے درد و کرب کی عکاسی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔یہ آپ بیتی بے باکانہ انداز، حق گوئی اور منفرد طرز نگارش کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔یہ خودنوشت عورتوں کی بیداری اور ان کے حقوق کی بازیابی کا پیغام دیتی ہے۔زبیر رضوی کی خودنوشت سوانح ''گردش پا'' اپنی سبک روی، مزاج، اسلوب اور تازہ کاری کے لحاظ سے منفرد ہے، اور اس میں موضوعات کا تنوع ہے، جس میں ذاتی زندگی کے مسائل سے لے کر ادب سیاست، فلم، کھیل کود، ریڈیو، ٹی۔وی اور حسن و عشق کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔

ان خودنوشت سوانح عمریوں کے علاوہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اور بھی کئی اچھی اور کامیاب خودنوشت سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں حمید نسیم کی ''ناممکن جستجو''، شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، ندا فاضلی کی ''دیواروں کے بیچ'' اور ''دیواروں کے باہر''، اویس احمد دوراں کی ''میری کہانی'' اور خلیق ابراہیم خلیق کی ''منزلیں گرد کے مانند'' وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں، جنھوں نے اردو ادب میں خودنوشت سوانح عمری کی روایت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں خودنوشت سوانح عمری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔خاصی تعداد میں ادیب، شاعر، سیاستداں، مفکر اور اہل دانش حضرات نے اس صنف کی طرف توجہ کی۔ادھر دس پندرہ برسوں میں ہندو پاک میں کئی یادگار خودنوشت سوانح عمریاں منظر عام پر آئیں، جن میں کچھ تو توقع سے زیادہ پسند کی گئیں اور کچھ قاری کی توقعات کو پوری نہ کر سکیں۔

یوں تو اردو ادب میں خودنوشت سوانح عمری کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا مگر اس کی رفتار میں تیزی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد آئی، اور آزادی کے بعد تو اس کی رفتار میں مزید تیزی آئی اور آج اس کی ترقی کی رفتار کے مدّ نظر یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب میں خودنوشت سوانح کے امکانات روشن ہیں۔

کتابیات

آزاد، ابوالکلام، **تذکرہ**، لاہور، کتاب محل، ۱۹۴۵ء

احسان دانش، **جہان دانش**، لاہور، آرٹ پریس، ۱۹۷۵ء

احمد، کلیم الدین، **اپنی تلاش میں**، گیا، کلچرل اکیڈمی، ۱۹۷۵ء

احمد، ندیم، **"بیسویں صدی میں خودنوشت سوانح عمری"**
مشمولہ، خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، شمارہ، ۱۲۹، جولائی، ستمبر، ۲۰۰۲ء

الطاف فاطمہ، **اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا**، دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۸ء

احمد شجاع، حکیم، **خون بہا**، لاہور، تاج کمپنی، ۱۹۴۳ء

ادا جعفری، **جو رہی سو بے خبری رہی**، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء

اختر الایمان، **اس آباد خرابے میں**، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء

افضل حق، چودھری، **میرا افسانہ**، عنایت اللہ پرنٹر پبلشر، تاج کمپنی، ۱۹۴۳ء

انیس، قدوائی بیگم، **آزادی کے چھاؤں میں**، دہلی، قومی یکتا ٹرسٹ، ۱۹۷۵ء

ایبک، ظفر حسن، **آپ بیتی**، لاہور، اشرف پریس، ۱۹۶۴ء

بجنوری، عبدالطیف، **لطیف کی کہانی**، بجنور، مطبع مدینہ پریس، ۱۹۶۷

تھانیسری، جعفر، **تواریخ عجیب**، لاہور، اسلامی پریس، ۱۳۰۲ھ

تھانوی، شوکت، **ما بدولت**، لکھنؤ، ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۴۶ء

خان، مسعود حسین، **ورود مسعود**، پٹنہ، خدا بخش لائبریری، ۱۹۸۹ء

خان، احمد سعید چھتاری، **یاد ایام**، علی گڑھ، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۴۱ء

خان، یوسف حسین، **یادوں کی دنیا**، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۶۷ء

خلیق الزماں، چودھری، **شاہراہ پاکستان**، پاکستان، انجمن اسلامیہ، ۱۹۶۷ء

خواجہ حسن نظامی، **آپ بیتی**، دہلی، دلی پرنٹنگ پریس، ۱۹۱۹ء

دریا آبادی، عبدالماجد، **آپ بیتی**، لکھنؤ، مکتبہ فردوس، ۱۹۷۸ء

دہلوی، ظہیرالدین، **داستان غدر**، دہلی، مطبوعہ، ۱۹۱۰ء

رفعت سروش، **بمبئی کی بزم آرائیاں**، نوئیڈہ، نورنگ کتاب گھر، ۱۹۸۶ء

رفعت سروش، **اور بستی نہیں یہ دلی ہے**، نوئیڈہ، نورنگ کتاب گھر، ۱۹۹۲ء

رفعت سروش، **پتہ پتہ بوٹا بوٹا**، نوئیڈہ، نورنگ کتاب گھر، ۱۹۹۵ء

رفعت سروش، **نقوش رفتہ**، نئی دہلی، ناشر رفعت سروش، ۱۹۸۳ء

رضوی، زبیر، **گردش پا**، دہلی، ناشر ذہن جدید، ۲۰۰۲ء

سالک، عبدالمجید، **سرگذشت**، لاہور، قومی کتب خانہ، ۱۹۶۶ء

سرور، آل احمد، **خواب باقی ہیں**، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۱ء

سحر، مہندر سنگھ بیدی، **یادوں کا جشن**، کراچی، ناشر رئیس امروہی، ۱۹۸۳ء

شکیل الرحمٰن، **آشرم**، دہلی، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء

شمع نفیس بانو، **جنت سے نکالی ہوئی حوا**، دہلی، آبشار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

صبیحہ انور، ڈاکٹر، **اردو میں خودنوشت سوانح حیات**، لکھنؤ، نامی پریس، ۱۹۸۲ء

صدیقی، عتیق احمد، **یادوں کے سائے**، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۴ء

صدیقی، اطہر، **میں کیا میری حیات کیا**، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء

صدیقی، رشید احمد، **آشفتہ بیانی میری**، دہلی، کوہ نور پریس، ۱۹۷۲ء

علی، عابد، **مزدور منسٹر**، بمبئی، انقلاب پبلیشرز

علی، ڈاکٹر شاہ، **اردو میں سوانح نگاری**، کراچی، انجمن پریس، ۱۹۶۱ء

عظیم آبادی، شاد، **شاد کی کہانی شاد کی زبانی**، اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹۵۸ء

علی، سر رضا، **اعمال نامہ**، دہلی، ہندوستان پبلشر، ۱۹۴۳ء

علوی، وہاج الدین، **اردو خودنوشت سوانح: فن وتجزیہ**، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء

عقیل، سید محمد، **گئو دھول**، الٰہ آباد، انجمن تہذیب نو، ۱۹۹۵ء

غلام السیدین، خواجہ، **مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں**، دہلی، غلام السیدین ٹرسٹ، ۱۹۷۴ء

فاخرہ، ممتاز، **اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا**، دہلی، رونق پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء

فتح پوری، ڈاکٹر فرمان، **اردو نثر کا فنی ارتقا**، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء

کاشمیری، شورش، **بوئے گل نالۂ دل دودچراغ محفل**، لاہور، مطبوعہ چٹان لمیٹڈ

کشور ناہید، **بری عورت کی کتھا**، نئی دہلی، ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

کلیم عاجز، **وہ جو شاعری کا سبب ہوا**، پٹنہ، بزم کاف، ۱۹۷۶ء

کلیم عاجز، **جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی**، نئی دہلی، عرشی پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء
کلیم عاجز، **ابھی سن لو مجھ سے**، دہلی، سیٹی پریس، ۱۹۹۲ء
متل، گوپال، **لاہور کا جو ذکر کیا**، دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۱ء
مدنی، محمد حسین احمد، **نقش حیات**، دہلی، ناشر سید محمد احمد، ۱۹۵۳ء
مدھولی، عبدالغفار، **ایک طالب علم کی کہانی**، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، ۱۹۶۵ء
مفتون، دیوان سنگھ، **ناقابل فراموش**، دہلی، پبلیشر دیوان سنگھ، ۱۹۵۷ء
میرزا ادیب، **مٹی کا دیا**، لاہور، نیاز احمد سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء
مہدی، مظہر، ''**بیسویں صدی میں اردو سوانحی ادب**'' (مضمون) مشمولہ،
گوپی چند نارنگ (مرتب) بیسویں صدی میں اردو ادب، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۰ء
نساخ، عبدالغفور، **سوانح عمری** (مخطوطہ)، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ نمبر ۹۷۴
وزیر آغا، ڈاکٹر، **شام کی منڈیر سے**، دہلی، سیمانت پرکاشن، ۱۹۸۶ء
وزیر سلطان جہاں، **نیرنگیٔ بخت**، جالندھر، ناشر ذکاء اللہ حسینی، ۱۹۴۲ء
Encyclopaedia Britannica,Vol.1.2,Chicago, 1973-74
The Oxford English Dictionary,Vol.1,London,Oxford University Press,1970

رسائل

نقوش، (لاہور)، آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ء
خدا بخش لائبریری جرنل، (پٹنہ)، شمارہ ۱۲۹، جولائی، ستمبر ۲۰۰۲ء
کتاب نما، (سرور نمبر)، (دہلی) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء
فکر و آگہی، (رفعت سروش نمبر)، (دہلی)، جلد نمبر ۵، شمارہ ۱، ۲، ۳، ۱۹۹۰ء
ارتقاء، (کراچی)، مارچ ۲۰۰۲ء
ہنس (ہندی)، (دہلی)، جولائی ۲۰۰۴ء
آج کل (ہندی)، (دہلی)، دسمبر، ۱۹۹۵ء
پونرنوا (ہندی)، (ویشیس انک)، (دہلی)، ۲۰۰۲ء
سمیانتر (ہندی)، (دہلی)، انک ۱، اکتوبر، ۲۰۰۳ء

Jawaharlal Nehru University
Library

AUTOBIOGRAPHIES OF URDU WRITERS AND POETS AFTER 1980

Dissertation submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

BY

MOHAMAD NAUSHAD ALAM

Supervisor

DR. MAZHAR HUSAIN

(Mazhar Mehdi)

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGE, LITERATURE AND CULTURE STUDIES
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067
INDIA
2005